ستارے
ملّا عبدالغنی

آزردہ ستارے

ملّا عبد الغنی

میسرز پیش رفت پبلیکیشنز، مسلم چوک گلبرگہ

ترتیب و تہذیب : ۱۔ جناب محمد قاسم پیارے، لکچرر کاڈ سدھیشور کالج ہبلی (ریٹائرڈ)
۲۔ جناب خالد سعید، لکچرر کرناٹک کامرس کالج بیدر

سرورق : جناب اعجاز مصور، گلبرگہ

کتابت : جناب واحد حسین شاہپوری، کوتوال گلی بلگام

طباعت : شری گرو آفسیٹ پرنٹرز، بلگام

سنہ اشاعت : سنہ ۱۹۸۶ء

تعداد : پانچ سو

قیمت : اٹھارہ روپیہ

کتاب ملنے کا پتہ : ۱۔ نصرت بک ڈپو کوئین روڈ، ہبلی
۲۔ مُلّا برادرس۔ جامع مسجد، جنگلی پیٹھ ہبلی

اسلامیہ لائبریری ہبلی کے اس پُر خلوص اولوالعزم
حلقۂ احباب کے نام
جس کے باصلاحیت کردار سے ہبلی میں
اردو کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا آغاز ہوا تھا

چمن میں اختلاطِ رنگ و بو سے بات بنتی ہے
ہمیں ہم ہیں تو کیا ہم ہیں تمھیں تم ہو تو کیا تم ہو

نامعلوم

فہرست

تفصیل نمبر	عنوان	صفحہ نمبر
۱	لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا	۷
۲	تخلیقیت کی تجدید	۱۵
۳	آزردہ ستارے	۲۳
۴	بیمار روشنی	۳۳
۵	دہلیز کے باہر	۴۳
۶	ایک شام	۵۱
۷	پہنچی وہیں پہ خاک.....	۶۱
۸	فیصلہ	۶۹
۹	ہاتھ خالی	۷۹
۱۰	اندھیرے کی چیخ	۸۹
۱۱	سفیرِ امن	۱۰۱
۱۲	معذرت	۱۰۹
۱۳	کھوکھلے سینے	۱۱۹
۱۴	بس ایک چائے کی پیالی	۱۲۹
۱۵	سِفارش	۱۳۷

کچھ گُل سے ہیں شگفتہ کچھ سرو سے ہیں قد کش

میر

لذت سے نہیں خالی جانوں کا کھپا جانا

اردو کی ساتویں جماعت میری زندگی کا ایک اہم موڑ تھا۔ ان دنوں ایک عزیز دوست بڑے میاں کی نتھری ستھری طبیعت نے مقناطیس کی طرح مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ عمر میں وہ مجھ سے بڑے تھے، تجربہ کار تھے۔ دھار واڑ سے انہوں نے ساتویں میں میرے اسکول میں داخلہ لیا تھا۔ اور یہ بات انہی کی زبانی معلوم ہوئی تھی کہ دھار واڑ کی ایک بری صحبت کی وجہ سے ساتویں کی ناکامی ظہور میں آئی تھی۔ مگر حیرت کی بات ہے کہ ساتویں کی ہم جماعتی کے دوران کبھی کوئی غلط اور گمراہ کن اشتعال انگیزی ان سے سرزد نہ ہوئی۔ ان کی صحبت میں ہمیشہ ایک دل و دماغ کو روشن کرنے والی یا چونکانے والی ذہانت یا کسی دھیمے، پرسوز، گمبھیر سمائے کا احساس چھایا رہتا۔ جیسے سہگل کے میٹھے سروں والے پرسوز گیت سن رہے ہوں۔ جیسے آہستہ آہستہ ابھرنے والی صبح کی پاکیزگی، سحر انگیز تازگی کی تصویر دیکھ رہے ہوں۔

اس زمانے میں میری نشست و برخاست، بول چال اور لباس کی تراش خراش پہ بھی ان کی چھاپ پڑی تھی۔ موسیقی اور مصوری کی ابتدائی تفہیم میں نے انہی سے سیکھی۔ یوں سمجھیے میرے پچھلے مزاج میں ان کی سال بھر کی صحبت نے ذوقِ سلیم کو زمیاں عطا کیں۔ ان کی اس بے غرض دین کو میں زندگی بھر نہیں اتار سکتا۔ ان کی دوستی کے تئیں قلبی احترام کے باوجود ذہن میں اندھے حسد کی مقابلہ آرائی کی فضا ہمیشہ بنی رہتی کہ پڑھائی میں مجھے ان سے کبھی ہیٹا ثابت نہ ہونا چاہیے اور اگر کبھی شکست ہو جاتی تو یہ احساس بڑی دیر تک دل کو مسوستا رہتا۔ ایک دفعہ ماہانہ حاضری اور پڑھائی میں مجھ سے زیادہ نمبر حاصل کرنے پر باضابطہ مانیٹری پر بڑے میاں کا حق ہو گیا۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کر مانیٹری میرے حق میں چھوڑ دی کہ میں ہی اس کا صحیح حقدار ہوں۔

میں دنگ رہ گیا۔ انکی بڑائی کے آگے میں گھٹنوں جھک گیا۔ آرٹ کی طرف ان کے ذہنی میلان سے جہاں میں متاثر تھا وہاں اس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا تھا کہ اعلیٰ صفات انسان ہی شعر، نغمہ یا تصویر کے تخلیق کار ہو سکتے ہیں اور فن ہی انسان کی صحیح عظمت کی معراج ہے۔

پڑھنے پڑھانے کا شوق اور کلاس میں اوّل نمبر آنے کا غرور مجھے بچپن سے تھا۔ اسکول سے اٹھا لئے جانے کے بعد تو اس کی کوئی سمت یا منزل مقرر نہ تھی مذہب، تصوف، شاعری، داستانیں جو ہاتھ آیا پڑھ ڈالا۔ نیز جو کچھ پڑھا۔ اس کے سمجھنے نہ سمجھنے یا یاد رکھنے کا سوال بھی نہ تھا۔ وہ یوں کہ مجھے کوئی امتحان دینا نہ تھا۔ تعلیم کا سلسلہ تو ساتویں جماعت پاس کر لینے کے بعد ہی ختم ہو گیا تھا۔ گھر میں جو چار فٹ اونچی چار فٹ چوڑی دو فٹ گہری الماری تھی۔ اس میں مذہبی کتابوں کا ڈھیر بھرا ہوا تھا۔ اور اسی ڈھیر میں ایک آدھ طبّی کتاب یا باغ و بہار، فسانۂ عجائب وغیرہ جیسی کتابیں بھی مل جاتی تھیں۔ طبّی کتابیں پڑھ کر مجھے کہاں ہاوَن دستے سے اپنا مغز کوٹنا تھا۔ البتہ باغ و بہار جیسی کتابیں جن میں قصہ کہانی ہو میں جھپٹ لیتا تھا۔ اور بڑی بے چینی سے پڑھ ڈالتا تھا۔ کیونکہ دل لگتا تھا ان میں۔ اور وقت بڑے آرام سے کٹ جاتا تھا۔ دراصل وقت گذاری بھی ایک مقصد تھا میرے پڑھنے کا۔ بیکاری تھی۔ بچپن جوانی سے گلے مل رہا تھا۔ ہمیشہ ایک اضطراری کیفیت سے دل بے چین سا رہتا تھا۔ نہ کوئی پختہ کار صحبت نصیب ہوئی تھی کہ اس سے زندگی بسر کرنے کا سلیقہ سیکھتے۔ البتہ کچھ ساتویں جماعت کے استاد جناب دولت آباد ماسٹر کی مہربانی تھی کہ انہوں نے غالب کے شوخ و شنگ فراخ کے قصّے نمک مرچ لگا کر سنائے تھے۔ اقبال کے پُر جلال لہجے کو سراہا تھا۔ نظیر کے قلندرانہ ٹھاٹ اور میر کی راکھ میں دبی ہوئی چنگاری

کے کبھی کبھی کریدنے پر چمک اٹھنے کی طرف توجہ دلائی تھی۔ خود بھی شاعری کرتے تھے۔ اور زندگی زندہ دلی کے قائل تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا تھا کہ میں بھی بڑے طمطراق سے شاعری پر اتر آیا۔ اور اپنے حساب سے دس بارہ نظمیں غزلیں بھی کہہ ڈالیں۔ مگر خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے چیگری پیراں (مرحوم) حضرت سیّد پیر بادشاہ قادری کو کہ جو خود بھی اردو اور فارسی میں اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔ حکمت جن کا پیشہ اور تصوف مسلک تھا۔ ایک دن کسی شاعرے کا ذکر کرنے لگے کہ ذرا قابل شاعر نے اپنے ہم عصر پر چوٹ کی تھی ہے "شاعری چارا سمجھ کر سب گدھے چرنے لگے" اور وہ ابھی اس مصرعہ کا ردِ عمل معائنہ بھی نہ کر سکے تھے کہ ان کے ہم عصر نے جھٹ سے گرہ لگائی "ہم تو چارا کھا گئے تم لید پر مرنے لگے"۔ بس ــــ میں بھی یہیں ختم ہو گیا۔ دل اچاٹ ہو گیا۔ پھر میں نے کہا۔ ہٹاؤ۔ کون چارا کھائے کون لید پر مرے اور اپنی ساری شاعری کو ماچس کی تیلی دکھا دی۔

اب سیدھے سیدھے چیگری پیراں کے مشورے کے مطابق میں آپ کے ذخیرۂ کتب سے استفادہ کرتا رہا۔ علامہ راشد الخیری اور مولانا عبدالحلیم شرر کو ذرہ برابر نہ چھوڑا۔ علاوہ آپ رسالہ پیغام حق، مست قلندر اور ہمدرد صحت کے مستقل خریدار تھے اور یہ رسالے بھی ہر ماہ میرے زیر مطالعہ رہتے۔ مگر آپ نے مجھے میرے شوق کے پیش نظر فرمایا کہ رسالہ عالمگیر، ہمایوں، ادبی دنیا یا ساقی کا خریدار بن جاؤں۔ لیکن ساقی کے مسلک سے آپ کچھ بدگمان بھی تھے۔ مگر میں پتہ نہیں کیوں سب سے پہلے ساقی ہی کا خریدار بن گیا۔ ہو سکتا ہے۔ اس میں نام ہی کی کشش کام کر رہی ہو۔ یا ذہن مست قلندر کی نس کا بنا ہو اب کیا دیکھتا ہوں۔ یہاں پر وہ سب لوگ دھوم مچائے ہوئے ہیں۔ جنہوں نے آئندہ چل کر اردو ادب کو علم و فن کی دولت سے مالا مال کیا۔ کرشن چندر، منٹو، فراق گورکھپوری

عصمت چغتائی، اختر الایمان، مجاز، محمد حسن عسکری، جاں نثار اختر، ن م راشد، فیض احمد فیض، میراجی، سردار جعفری وغیرہ ان شاعروں، ادیبوں کو پڑھ کر میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ منٹو اور عصمت کا پیرایۂ بیان اتنا بھایا کہ میرے دماغ پر دھن سوار ہو گئی کہ میں بھی کچھ لکھوں۔ دن رات قلم گھسیٹتا تھا۔ پھر چار پانچ سال میں اتنی ہمت پیدا ہوئی کہ ایک آدھ افسانہ دلی، لکھنؤ، بمبئی، الہ آباد یا حیدرآباد کے کسی معیاری رسالے کو بھیج دوں اور جب ایک افسانہ (اپنا پہلا افسانہ) رسالہ "آج کل" میں شائع ہو گیا۔ جس کے مدیر اس وقت جوش ملیح آبادی اور عرش ملسیانی تھے تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اور اس یقین کے ساتھ کہ ہم بھی کچھ ہیں۔ تین چار سال کے دوران میں سات آٹھ افسانے لکھ لیا تھا۔ اور ان میں سے چند معیاری رسالوں مثلاً شاعر بمبئی، شاہراہ دہلی، پردین الہ آباد، رباب حیدرآباد کو روانہ کر چکا تھا۔ سبھوں کا جواب اثبات میں تھا کہ افسانے شائع ہو جائیں گے۔ شاہراہ دہلی کے ایڈیٹر ظ۔ انصاری تھے۔ انہوں نے میرے ایک خط کے جواب میں مورخہ ۱۲؍ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو لکھا تھا۔

"آپ کے لفظوں سے انسانی دردمندی، خلوص اور سچائی کی مہک آتی ہے۔ دنیا میں آرٹ اور ادب کے لئے یہ اولین شرائط ہیں لیکن اس کے باوجود ناکافی ہیں۔ ایک مخلص دردمند اور سچے شریف آدمی کو ان اوصاف کے علاوہ مطالعے، مشاہدے اور ریاضت کی بھی ضرورت ہے۔ جب آپ اپنی تحریروں کو اس آگ میں تپا لیں گے تو ایک ظ۔ انصاری نہیں، سو ظ۔ انصاری آپکا پتہ پوچھتے پھریں گے"۔

ظ۔ انصاری کی بات میرے دل کو چھو گئی۔ اور میں دل و جان سے مشق اور مطالعہ میں جٹ گیا۔ اپنا معاشی لین دین تو یکسر عوام سے جڑا ہوا تھا۔ اس لئے مشاہدے

کا ایک بڑا خزانہ جمع تھا۔ اب اس میں سے کمالِ احتیاط سے چن کر پوری باخبری کے ساتھ فن کے فریم میں سجانے کی مہارت درکار تھی۔ اور میں یہ کام ایک آدھ سال ہی کر سکا تھا کہ میرا ایک لنگوٹیا یار تھا "گوکل سوامی"۔ ایک اعلیٰ متوسط درجے کے کسان گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ مست الست، اسے ایک بڈھے پٹیل کی میونسپل ممبری اور شہر کی لیڈری سے چڑ تھی۔ تیس سال سے اس پٹیل کی چنڈال چوکڑی کا راج شہر پر چل رہا تھا۔ دھوکہ دھڑی، ظلم و تشدد کا ایک چکر تھا جو رکنے میں نہ آتا تھا۔ مگر اس کے خلاف للکارنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ سوامی نے مجھے پٹیل کے خلاف زبردستی اس پُر خطر سیاست کے میدان میں اپنے ساتھ گھسیٹ لیا۔ اور پھر اس مہم میں کامیاب سے حوصلے اتنے بلند ہوئے کہ اب سیاست ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بن گئی۔ پھر سوامی کی شراکت میں کپڑوں کی تجارت (دوکانداری) کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ باپ دادا کی چھوڑی ہوئی جائداد کو بیچ کر دوکانداری میں پونجی لگائی گئی تھی۔ چوبیس گھنٹے تجارت اور سیاست کے ہیر پھیر میں گذر جاتے۔ اب مشق اور مطالعہ کے لئے وقت کہاں تھا۔ سیاست اب شہر کی حد پار کر کے اسٹیٹ لیول پر اپنی کرتب بازیاں دکھانے کی تاک میں تھی۔ منٹو اور عصمت کبھی کبھار ہی یاد آتے۔ فیض اور راجندر سنگھ بیدی اور قرۃ العین کو کہیں دیکھ پاتا تو دل ہی دل میں سلام کر لیتا اور حسرت سے تکتا رہ جاتا۔

تجارت ہمارا آبائی پیشہ نہ تھا۔ اور طبیعت بھی کچھ فقیرانہ بن گئی تھی لہٰذا تجارت کے داؤ پیچ میں مات کھا گئے۔ جان سے عزیز دوست گوکل سوامی کا انتقال ہو گیا۔ پھر کاروبار کی لیوادیوی میں گھر نیلام ہو گیا۔ اب جینے کے بھی لالے پڑ گئے، فاقوں کی نوبت تو آ ہی چکی تھی۔ بچوں کا اندیشہ ناک مستقبل بھی منہ پھاڑے سامنے کھڑا ہو گیا۔ مگر ہمت نہیں ہاری۔ ضمیر اپنے ساتھ تھا نا۔ اس "کڑکی" کے زمانے میں کبھی کبھی اپنے کروفر

کو دیکھتے ہوئے ہم ہمیشہ پوچھتے تھے۔ "اس سانحے کے بعد آپ زندہ کیوں کر ہیں"۔

"ارے ظالمو! اب تمہیں ہمارا زندہ رہنا بھی کھلنے لگا ہے۔"

اوف ۔۔۔ یوں اپنی زندگی کے باسٹھ تر سٹھ سال بسر ہو گئے ۔ مگر زندگی سے کوئی شکوہ نہیں۔ بننا بگڑنا اپنے ہی عمل سے ہوتا ہے۔ زندگی بھلی بُری جیسی بھی بسر ہو گئی یہی ایک بڑا اطمینان ہے۔ کہ بھرپور بسر ہوئی۔ سچے جھوٹے، بھلے بُرے سبھی لوگوں سے واسطہ پڑا۔ اور ان سبھوں کو پرکھ کر پہچان کر نبھایا۔ اور بڑے خلوص اور بڑے پیار سے نبھایا۔ یہی اپنی زندگی کا سرمایہ ہے۔ اور آخرت کا بھی۔

اب بچوں کا نیا کاروبار اپنے کرم فرما مجاہد وکیل صاحب، ڈاکٹر خطیب صاحب الحاج محمد غوث ہند دستگیری، شری ایس ۔ اے ۔ کرڈی، ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر ہبلی دھارواڑ میونسپل کارپوریشن اور اپنے ہم زلف جناب ایس ۔ ایم ۔ شلیدار، اپنی بڑی بیٹی زینت ساجدہ اور داماد عبدالمجید اور ایک ادبی ساپڑوسی گھٹروصاحب باگوان کی مدد سے کھڑا ہو گیا ہے۔ تو جوگ اس لئے نہیں لیا کہ ابھی کچھ کام باقی ہے۔ اور وہی کام اب کر رہا ہوں۔

اس کام میں پروفیسر بیارے کی نیک نفسی اور حوصلہ افزائی اگر شاملِ حال نہ ہوتی تو یقین مانئے میرا یہ بے مایہ ادبی کام جہاں برسوں کوڑے کباڑ میں گرد آلود پڑا تھا وہاں میری زندگی میں تو سورج کی روشنی اور تازہ ہوا کھانے سے محروم رہ جاتا۔

پروفیسر بیارے نے گھنٹوں بلکہ دنوں میرے ان افسانوں کے سنوارنے میں مغز پاشی کی۔ زبان اور بیان کی پیچیدہ نکات کی فہمائش میں میرے چوچلوں کو برداشت کیا۔ کبھی کبھی تو میری ضد کا برا نہ مانا۔ ان کی اس عالی ظرفی کا میں تاحیات احسانمند رہونگا۔

نیز ایک باصلاحیت، پرخلوص نوجوان شاعر دوست جناب خالد سعید کا ممنون ہوں۔ جنہوں نے اپنی اعلیٰ تعلیمی و تدریسی مصروفیتوں کے باوجود مسودے کو دیکھنے کی خواہش

ظاہر کی۔ افسانوں کی خامیوں کی طرف اشارہ کیا اور خوبیوں پر دل کھول کر داد دی۔ اور کتاب کی ترتیب اور تزئین پر اپنی قیمتی رائے دینے اور کتابت اور طباعت کی اندھی گلیوں کی سیر کرانے کی زحمت جھیلی۔ اور نشر و اشاعت کے لئے میسرز پیش رفت پبلیکیشنز گلبرگہ کے بیش بہا خدمات سے مستفیض ہونے کا موقع فراہم کیا۔ ان ہونہار شاعر کی گرم دلی، پرکھ اور جرأت اظہار سے میں اس درجہ متاثر ہوا ہوں کہ ان کی جگہ ابھی سے ادبی جگادریوں کے شہ نشینوں میں دیکھ رہا ہوں۔ خدا میرا یہ خواب سچا کر دکھائے۔ آمین۔

اور ڈاکٹر جاوید رفاعی کا مشکور رہوں کہ آپ نے اگر ہبلی کرناٹک کے خوشنویس جناب واحد حسین شاہپوری کو نہ ڈھونڈ نکالا ہوتا تو نہ جانے اس بڑھاپے کے جنون میں میں کہاں کہاں حیدرآباد، گلبرگہ یا بنگلور کی گلیوں، بازاروں میں بھٹکتا ہوتا۔ اور ہبلی کرناٹک میں اردو کے اس افسانوں کی کتاب کے سر اسکی طباعت اور کتابت کی اوّلیت کا سہرا نہ بندھا ہوتا۔ جناب جاوید رفاعی کی نظر انتخاب اور تن دہی سے ہی میں جناب واحد حسین شاہپوری کے طاقت سے بھرپور اور خوبصورت قلم کو حاصل کر سکا۔ اور بلگام کے گرو آفسیٹ پرنٹرس کی طباعت پسندِ خاطر ہوئی۔ جناب واحد حسین شاہپوری نے کتابت کی ذمہ داری کو کم سے کم معاوضہ پر نہایت خوبی سے نبھایا۔ خدا ان کی عمر اور رزق میں برکت دے۔

اس کے علاوہ میرے کرم فرما جناب ضیا میر مدیر ادبی ایڈیشن روزنامہ سالار بنگلور اور جناب مظہر محی الدین کا بھی شکر گذار ہوں کہ کتاب کی طباعت سے متعلق ضروری ابتدائی معلومات سے مجھے آگاہ کیا۔ اور ہر طرح اپنے تعاون کا یقین دلایا۔

اور مشکور ہوں کہ جناب اعجاز مصور گلبرگہ نے جناب خالد سعید کی درخواست پر سعودی عربیہ سے سرورق کی تصویر بنا کر بھیجنے کی زحمت گوارہ فرمائی۔

اور اب ـــــ اجازت چاہتا ہوں کہ

بس ہجوم نا امیدی خاک میں مل جائیگی
یہ جو کہ اک لذت ہماری سعیٔ بے حاصل میں ہے

غالبؔ

ملّا عبدُ الغنی

۳۰ ستمبر ۱۹۸۶ء

تخلیقیت کی تجدید

سب سے پہلے تو میں اس بات کا اعتراف کرلوں کہ بمبئی کرناٹک کے کسی معتبر نثر نگار کا نام میرے ذہن میں نہیں تھا۔ بس دو ایک نامور شاعر یاد تھے جو اس علاقے کی نمائندگی کرتے تھے۔ لیکن جب ریسرچ کے سلسلے میں اس علاقے کے دورے پر تھا تو میری ملاقات مُلاّ عبد الغنی اور ان کی تخلیقات سے ہوئی۔ ان کی تخلیقات پڑھ کر ایک استعجاب آمیز مسرت ہوئی کہ یہ علاقہ کسی بھی دور میں بنجر نہیں رہا۔ ان کی کہانیوں کے موضوعات و اسالیب وہی ہیں۔ جو ترقی پسند ادبی تحریک کے رہے تھے۔ اب سوال یہ کہ ان بدلے ہوئے رجحانات و حالات میں ان تخلیقات کا موقف کیا ہے؟ اس کا ایک شافی جواب تو یہ ہے کہ یہ ساری تخلیقات کوئی پچیس تیس سال پہلے لکھی گئیں۔ اور اس دور کے ادبی رسالوں میں شائع بھی ہوئی تھیں۔ اور جنہوں نے ادبی جغرافیہ کے نقشے میں اس علاقے کی نمائندگی بھی کی تھی۔ اس کے علاوہ جی دار تخلیقات، زمانہ اور رجحانات بدلنے کے باوجود پڑھی جانے کے قابل رہتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ماضی کے ادب کو محفوظ رکھنے کا جواز نہ ہوتا۔ دوسری اہم بات یہ کہ یہ کہانیاں ہمیں ایک ایسے فنکار سے روشناس کراتی ہیں جس کے اندر باوجود ترقی پسند اثرات کے، اپنی آنکھ سے زندگی کو دیکھنے اور سمجھنے کی قوت بھی موجود تھی۔ اور ایک شدید تخلیقی لپک بھی۔ جو معاشی سرگرمیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ لیکن پھر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی تجدید کرنا چاہتا ہے۔ جس کا ثبوت یہ کتاب ہے۔

مُلاّ عبد الغنی کی کہانیوں کی جن خصوصیت نے مجھے متاثر کیا وہ ہیں طنز،

استعارے اور تمثیل کا رجحان اور مقامیت۔ چونکہ ان کے موضوعات اشتراکی فکر کی رہینِ منت ہیں۔ اس نظریے کے لئے طنز ایک بہترین Tool ہے۔ ان کے ہاں طنز دو طور سے آیا ہے۔ ایک تو یہ کہ سماجی، معاشی، سیاسی یا کسی بھی عیب یا کوتاہی پہ طنزیہ فقرے کسنا جہاں کہیں بھی ایسی صورتحال پیدا ہوئی انہوں نے اسے گنوایا نہیں دل و دماغ کو چٹکیاں لینے والے جملے لکھے۔ طنز کی دوسری صورت یہ کہ سماجی حقیقت نگاری کے تحت سرمایہ دارانہ استحصال و استبداد اور طبقاتی تفریق سے پیدا ہونے والے مسائل کو افسانوں کے قالب میں ڈھالتے ہوئے طنز کو کہانی میں شامل کیا ہے۔ یعنی ان مسائل پہ تلخ لب و لہجے میں اپنے غم و غصہ اور نفرت کا اظہار کیا ہے۔ اور قاری کو بھی اس میں گھسیٹ لیا ہے۔ لیکن یہ طنز کی اتھلی سطح ہے۔ جیسے پانی پر تیل کی بوند تیرتی رہ جائے۔ دراصل طنزیہ افسانے لکھنا اتنا آسان بھی نہیں۔ اس قسم کے افسانوں میں طنز کی تخلیقی صورتحال وہ ہوتی ہے۔ جہاں وہ کہانی کی تخلیقی رو کے ساتھ پنپتا، پھیلتا ہوا فن بن جاتا ہے۔ تیل کی بوند کی طرح علیحدہ تیرتا نہیں رہتا۔ گرچہ کہ وہاں بھی طنز کا مقصد تلخیوں اور کوتاہیوں کو ابھارنا ہی ہوتا ہے۔ لیکن وہاں مطعون چیزوں سے نفرت کرنا نہیں سکھاتا بلکہ ایک ایسی بصیرت عطا کرتا ہے جس سے قاری اس طنزیہ صورتحال یا اس حقیقت پر از سرِ نو غور کرنے پر مائل ہو جاتا ہے۔ کوتاہیوں کی تلخی اور حقیقتوں کے دکھ جھیلنے کا حوصلہ بھی حاصل کرتا ہے اور یہ کام طنز بڑی خاموشی سے کرتا ہے۔ جیسے "پہنچی وہیں پہ خاک" میں امیر گھر کی لڑکی اپنے شوہر کی بے روزگاری اور تنگ دستی کا گلہ نہیں کرتی۔ بلکہ ہر طرح سے اس کی دلجوئی کرتی رہتی ہے۔ لیکن گھر کے ٹھنڈے فرش پر زچگی کی اذیتوں کو جھیل کر اپنی ہی جیسی بدنصیب لڑکی کو جنم دیتی ہے۔ تب شوہر کی آمد پر اس کی بے کاری اور مجہولیت

پر مغلظات بکتی ہوئی، اس کے تئیں اپنی سخت نفرت کا اظہار کرتی ہے۔ اور بے ہوش ہو جاتی ہے۔ یہیں پر تو معاشی بدحالی کے آگے رشتے ناطوں اور محبت وایثار کا ملمع اتر جاتا ہے۔ دراصل یہی تو وہ سچا اور برہنہ لمحہ ہے۔ یہی تو وہ طنز ہے۔ جو کہانی کی تخلیقی رو کے ساتھ پھیلتا ہوا بڑی شدت سے پھوٹ پڑتا ہے۔ جو ہمیں ان حقائق سے نفرت کرنا نہیں سکھاتا بلکہ زندگی کی حقیقیوں اور رشتوں کی معنویت پراز سر نو غور کرنے پر مائل کرتا ہے۔ اس طنز کے پیرائے میں مصنف کی ذات کہیں بھی شامل نہیں ہے۔ یہ بڑا خاموش اور تیکھا طنز ہے۔ اس طرح کے کامیاب طنز یہ افسانے دو ایک اور ہیں۔ جیسے بیمار روشنی، ایک شام وغیرہ کہنے کا مطلب یہ کہ اسی طنز کا وار کاری ہوتا ہے جس کا انکھوا کہانی کے بطن سے پھوٹتا ہے اور جو وضاحت سے گریز کرتا ہے۔

وضاحت سے گریز کی پابندی ہر تخلیقی فنکار کے لئے لازمی ہے۔ خود مُلّا صاحب نے بھی، باوجود ساری اشتراکیت نوازی کے وضاحت اور بیانیہ کے علاوہ کہیں کہیں استعاراتی اور تمثیلی پیرایہ بھی اختیار کیا ہے۔ جس کی وجہ سے نہ صرف تخلیق سے لطف اٹھانے کے امکانات بڑھ گئے ہیں بلکہ ان کی تخلیقی اپج پر بھی دال ہے۔

> "سامنے کہیں نعروں کی آواز بلند ہوئی۔ ان کا خیال سکھوں کی طرف گیا۔ کیونکہ ان کی سرگرمیاں جلسے جلوس کی صورت میں زوروں پر تھیں۔ مگر جیسے جیسے وہ بڑھتے گئے۔ نعرے صاف سنائی دینے لگے۔ "پنڈت جواہر لال نہرو کی جے۔ راجندر پرساد کی جے۔ ابوالکلام آزاد کی جے۔"
>
> "اوہو ــــ یہ تو اپنے ملک کو آزاد کرانے والوں کی جے کار ہے۔""

"مگر آج کس سلسلے میں کوئی وزیر تو نہیں آیا۔" قمر اور سلامت یہی باتیں کر رہے تھے کہ بھینڈی بازار کی جانب سے مُردگدبل میں دس بیس نوجوان ایک بگڑی ہوئی موٹر کو دھکیل دھکیل کر لڑھکاتے ہوئے آرہے تھے۔ ڈرائیور چیختا ہے۔ "پنڈت نہرو کی" موٹر دھکیلنے والوں کا جوش بڑھتا ہے۔ اور فضا گونج اٹھتی ہے۔ "جے۔"

"راجندر پرساد کی"

"جے"

"ابو الکلام آزاد کی"

"جے" بھئی واہ۔ قمر اور سلامت ہنسنے لگے۔ چوک میں کھڑا ٹریفک پولس ہنس رہا تھا۔ دوکاندار اپنی بیٹھکوں سے جھک جھک کر دیکھتے ہوئے ہنس رہے تھے۔"

(ایک شام)

یہ مضحک صورتِ حال ہمارے ملک کی لنگڑی سیاست پر ایک عمدہ تمثیلی طنز ہے۔ یہ تھا تمثیلی پیرایہ۔ "اندھیرے کی چیخ" میں اندھیرے کے سینے پر بجھتے ہوئے لیمپ کے حباب سے اٹھتی ہوئی چنگاریوں کی لکیر، اور آخر میں لیمپ کا بھٹ ٹا کر بجھ جانا۔ دراصل یہ سارا منظر ایک استعارہ ہے۔ کملا کی جنسی تشنگی اور جنسی ہیجان کا۔ اخلاقی قدر اور جنسی ترغیب کی کشمکش کا۔ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ جانے کا ہنر محض اس استعاراتی پیکر سے پیدا ہوا ہے۔ یوں بھی ان کے ہاں منظر کو اور کہیں کہیں واقعہ کو بھی استعارہ یا تمثیل بنانے کا شغف ملتا ہے۔ جب بات استعارے کی چل پڑی ہے تو ان کے ایک مخصوص استعارے کی طرف اشارہ کرنا چاہوں گا۔ جس سے ان کی تخلیق اور نفسیاتی وابستگی انتہائی شدید ہے۔

وہ ہے "رات"۔ ویسے بھی رات ترقی پسند ادبی تحریک کی راندۂ درگاہ علامت رہی ہے لیکن ان کے ہاں اس مروجہ معنویت سے سوا، نفسیاتی پس منظر زیادہ رکھتی ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں میں رات، اندھیرا، شام، چراغ، روشنی اور دیگر متعلقات کے قرینے پائے جاتے ہیں۔ جو اس استعارے کی مروجہ معنویت سے زیادہ داخلی معنویت بھی خلق کرتے ہیں۔

"دہلیز کے باہر" کا یہ ٹکڑا دیکھیے۔

> "اور اس کی بھوکی پیاسی روح جوانی کے اس اندھیرے صحرا میں اس کوندے سے لپٹنے کے لئے بے چین ہو اٹھی۔ "ہاں کر لیتے ہیں۔ کر لیتے ہیں" اور وہ اسی رات کو دہلیز کے باہر اس کا رستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ ننھی اس اندھیرے کو بھانپ گئی جو اس کے اطراف رینگ رہا تھا۔ مگر ننھی بجلی ہی تو تھی۔ ایسے گری کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سوکھ گیا۔"

"دہلیز کے باہر" اور "اندھیرے کی چیخ" میں رات جنسی ترغیب اور جنسی ہیجان کے لئے مہمیز ہے۔ ساتھ ہی "وہ" اور "کملا" کے بطون کی تاریکی ان کے نفسیاتی خوف اور نفسانی خواہشات سے عبارت بھی ہے۔ "معذرت" میں ماحول پر پھیلی ہوئی تاریکی اور سناٹا دو بہنوں کے دوستانہ رشتے پر پھیلی ہوئی تشکیک کی سیاہی سے معنون ہے۔ اور ساتھ ہی آپا کی بے چارگی اور ان کی روح کے سناٹے کی بھی مظہر ہے۔ "سفیر امن" میں رات مشترکہ خاندان کے مسائل سے گھبرائے ہوئے جوڑے کی پناہ گاہ ہے۔ جو ان کی ازدواجی زندگی کی مسرتوں کی تجدید کرتی ہے۔ اور خاندانی رشتے کو مضبوط کرنے والی گرہ بھی ہے۔ جبکہ "پہنچی وہیں پہ خاک" میں رات کا اندھیرا تخلیقی تسلسل اور ازدواجی زندگی کی الفت و محبت کی مہر ہے۔ "فیصلہ" میں رات اگرچہ کہ سرمایہ دارانہ استحصال کے معنی

ہی رکھتی ہے ۔ لیکن عاشور خانے کے تناظر میں رات کے اندھیرے سے چراغ کا لڑنا حق و باطل کی کشمکش اور ایثار کی معنویت بھی خلق کرتا ہے ۔ اور افسانے کے آخر میں گیس بتی کی روشنی، تھکی ماندی بوڑھی ماں کے لئے زندگی کا حوصلہ بن جاتی ہے۔ تو گیس بتی کی "بھر ر" سی آواز نو بیاہتا مگر ٹھکرائی ہوئی دلہن کے لئے خوش آئند زندگی کی نوید بھی۔ کھوکھلے سپنے" میں کہر کی دھند میں پھیلی ہوئی خنک زرد چاندنی، الطاف اور شکیل کے خوابوں کی شکست ہے تو دھند، سماجی جبر کا استعارہ ۔" بیمار روشنی" میں شام کی دم توڑتی ہوئی بیمار روشنی، عذرا اور رفید کے بیمار اور بزدلانہ رشتے کا استعارہ ہے۔ دراصل وہ دونوں ایک دوسرے کے تئیں جنسی کشش اور رغبت رکھتے ہیں ۔ لیکن عام اور اوسط مسلم گھرانوں کے لڑکے لڑکیوں کی طرح اپنے اس جنسی رشتے پر بھائی بہن کے تقدس کی چادر بھی ڈالے رہتے ہیں۔ گویا وہ دونوں نہ تقدس میں کھرے نہ محبت میں ۔ شام کی بیمار روشنی ان کی اسی ریاکاری کا استعاراتی پیکر ہے ۔ شام کا پھیلتا ہوا سرد اندھیرا ان کے بیمار تعلق میں پیدا ہونے والی سرد مہری کا اشارہ ہے۔ غرض رات اور اس کے متعلقات مختلف ڈھنگ سے ان کے پاس آئے ہیں۔ جو ان کے نفسیاتی کیفیات کی بھی مظہر ہیں ۔ لیکن حد سے زیادہ وضاحت اور بیانیہ نے اس استعارے سے لطف اٹھانے کے امکانات کم کر دیئے ہیں۔ اگر ملّا صاحب وضاحت سے گریز کرتے رات ان کے ہاں علامت کے طور پر ابھرتی۔ لیکن کیا کرتے ترقی پسند تحریک اپنی مقصد پسندی کے تحت وضاحت پر زیادہ توجہ دیتی رہی ہے ۔ سو یہ عیب ان کے افسانوں میں بھی پایا جاتا ہے ۔ تاہم انہیں تمثیل اور استعارے سے دلچسپی ضرور ہے ۔ نہ صرف منظر بلکہ واقعات میں بھی معنویت تلاش کر لیتے ہیں ۔ اور خصوصاً اپنے اطراف کے ماحول سے کچھ زیادہ ہی شغف ہے ۔ اسی شغف کے سبب تو ان کے افسانوں میں ایک مقامی فضا پائی جاتی ہے ۔

مقامیت ان کے افسانوں میں کسی مخصوص علاقے کی جغرافیائی منظر کشی تک محدود نہیں۔ اگر یوں ہوتا تو کوئی خاص بات نہ ہوتی۔ بلکہ ان کے ہاں مقامیت مخصوص علاقے کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی اور اس کے برتاؤ سے بڑھ کر زبان اور بیان کے انداز تک پہنچ گئی ہے۔ انہوں نے بہت سے مقامی الفاظ، محاورے، کہاوتیں بھی بلاجھجک برت لئے ہیں اور اس تخلیقانہ تندی میں کہیں کہیں گرامر مجروح ہوئی ہے۔ ہو سکتا ہے اہلِ زبان واہلِ علم اس پر ناک بھوں چڑھالیں۔ لیکن ایک تخلیقی فنکار کو اتنی آزادی تو ملنی چاہیئے۔ اس جرأت سے انہیں دو فائدے حاصل ہوئے۔ ایک تو ان کے کرداروں میں زندگی پیدا ہوئی اور وہ مصنوعی پن سے بچ گئے۔ تو دوسرا فائدہ یہ کہ ان کے اظہار و بیان میں ایک کھراپن پیدا ہوا ہے۔ جس کے سبب ان کی بیدار ذہنی اور تخلیقی اپج تسلیم کرلی جائے گی۔ اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ اس رنگ ڈھنگ کو صرف وہی فنکار اپنا سکتا ہے جو ذہنی مرعوبیت کا شکار نہ ہو اور ایک شدید تخلیقی مزاج بھی رکھتا ہو۔ باوجود اس تند تخلیقیت کے، ان کی بعض کہانیاں، محض اشتراکیت کی گرم جوشی کے تحت بھری ہوئی شخصیت کی جھلاہٹ بن کر رہ گئی ہیں۔ یا پھر اشتراکی فکر کا اشتہار۔ فن نہیں بن پائیں تاہم یہ سچ ہے کہ انہوں نے ساری کہانیاں اپنے اطراف بکھری ہوئی زندگی سے چنی ہیں اس انتخاب میں ان کے تلخ و تند تجربے بڑے ہی ممد رہے ہیں۔ ان کی تخلیقی بصیرت اور مشاہدے نے واقعات اور حادثات میں پوشیدہ معنویت کو ڈھونڈ نکالا۔ ان کے افسانوں کے کردار، واقعات، حالات، ماحول سبھی ان کے لہجے کی طرح تیکھے، کھردرے اور کھرے ہیں۔ سوائے ایک زاویۂ نظر کے۔

غرض جس فنکار کے پاس اس قدر وسیع مشاہدہ ہو۔ تلخ تند اور شیریں تجربات کا انمول خزانہ ہو۔ تیکھا لب و لہجہ ہو، اظہار و بیان کی قوت ہو اور ان سب سے بڑھ کر

واقعات میں معنویت تلاش کرنے کا سلیقہ ہو، تو ایسے فنکار سے امید رکھی جا سکتی ہے کہ آگے جو کہانیاں لکھی جائیں گی یقیناً وہ اظہار و بیان کے پرانے پن سے ہٹ کر اس کی اپنی ذات کے اسلوب میں لکھی جائیں گی۔ جو ذات کی طرح گہری، پیچیدہ اور مالا مال ہوں گی۔ مجھے انھیں کہانیوں کا انتظار رہے۔

خالد سعید

۱۱ر نومبر ۱۹۸۶ء سنہ ء۔

بیدر

آزردہ ستارے

آج میں تمھیں خط لکھنے بیٹھا ہوں تو القاب کے لئے کسی لفظ کو موزوں نہیں پاتا۔ چونکہ مجھے تم سے جس قسم کا جذباتی لگاؤ ہے اس کی ترجمانی کے لئے اس سے پہلے سوچنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایک مرتبہ کسی صاحب سے تمھیں میرا تعارف کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی تو تم نے مجھے اپنا چھوٹا بھائی بتایا تھا۔ میں سمجھ گیا تم اپنا پلہ بھاری رکھنا چاہتے تھے۔ مگر میں لوگوں کو یہ موقع کیوں دوں کہ وہ مجھے تم سے کمتر سمجھیں۔ میں نے فوراً بتا دیا تھا کہ میں تمھارا چچا ہوں۔ اور وہ صاحب بغیر کسی تکلف اور مزید وضاحت کے ہمارے تعلقات کو اچھی طرح سمجھ گئے تھے لیکن اگر آج بھی میں وہی ناطہ یہاں لکھ دوں تو ڈر ہے تم کل کلاں میرے لوٹے

چھوٹے گھر کے بھی حصہ دار نہ بن بیٹھو۔ خاص کر ایسی حالت میں جبکہ میری نرینہ اولاد اللہ کو پیاری ہو چکی ہے۔

تم سوچ رہے ہوں گے کہ آج مجھے خط لکھنے کا شوق کیوں کر چرایا۔ یہ سچ ہے کہ چچا غالب کا زمانہ تو نہیں رہا کہ نام کی عاشقی میں بغیر مطلب کے بھی خط لکھا کریں۔ علاوہ ازیں زندگی بسر کرنے کا ہمارا طریقہ بھی کچھ ایسا ہے کہ بھیڑ کی طرح سر نہوڑائے چلے جا رہے ہیں۔ پاس پڑوس، گلی محلہ اور ملک و قوم سے اسقدر بیگانے کہ یقین نہیں آتا۔ آج ہم اپنی ہستی کا کوئی جواز نہ پیش کرتے ہوئے زندہ کیوں کر ہیں۔ سوچو تو ہم سے کوئی حادثہ ہو گیا ہوتا تو اس کے اطلاع کی ضرورت نہ پڑتی ہمیں۔ حادثے کے ذکر پر مجھے تمہارا وہ خیال یاد آیا۔ بمبئی جاتے وقت تم کہہ رہے تھے کہ کوئی نہ کوئی حادثہ تمھیں فلم انڈسٹری میں ضرور داخل کرا دے گا۔ یعنی اسٹوڈیو کے پھیرے لگائے جاؤ، ممکن ہے کسی ایکٹریس کی موٹر تلے آکر زندہ رہ جاؤ تو یہ آرزو بھی پوری ہو۔ موجودہ حالت میں تنظیم اور ترتیب کے ساتھ قسمت آزمائی کا یارا کہاں۔ بھائی حادثے کرو اور کامیاب ہو جاؤ۔ اس وقت میں بالکل نہیں سمجھ سکا تھا کہ یہ تم طنزاً کہتے ہو۔ یا حقیقت بھی یہی ہے۔ لیکن ادھر چند دنوں پہلے تمھارے متعلق افواہ گرم تھی کہ اسٹوڈیو کے پھیرے لگانے میں تم نہایت باقاعدگی کا ثبوت دے رہے ہو۔ باوجود میں تمھارے اس خیال کے موئد ہونے کے اس باقاعدگی کو پسند نہ کر سکا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں ایسے چھوٹے حادثے کا ہونا تم سے بعید ہے۔ لیکن پھر بھی اس بانجھ حرکت کو تم سے منسوب ہوتے ہوئے دیکھ کر میں بہت ہی کڑھا۔ البتہ اس افواہ سے "بابلی" کی باچھیں کھل گئیں اور وہ نتیجہ کا انتظار کیے بغیر ابھی سے بمبئی کے توشے کی تیاری میں مصروف تھا۔ وہ تمھیں اُن دنوں اتنے پیار اور احترام سے یاد کرتا تھا کہ بے اختیار تمھارا وہ جملہ زبان پر آجاتا ــــ "بابلی، تم ابھی بچہ ہو۔

ہونٹوں سے دودھ نہیں چھوٹا"۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ تم جب ایکٹر بن جاؤ گے تو تمھاری
ایکٹنگ کی ہر جگہ دھوم مچ جائے گی۔ ایک دو چانس ایکٹنگ کے ملنے کے بعد تم ایکدم
ڈائریکٹر بن جاؤ گے۔ اور جب ڈائریکٹر بن جاؤ گے تو پروڈیوسر بننے میں کیا دیر لگےگی۔
اس طرح جب تمہاری قسمت کا ستارہ چمک جائے گا تو "بابلی" ایسے سینکڑوں کی قسمت
کا ستارہ چمکانا تمھارا روز کا معمول ہوگا۔ لیکن اس کے بعد ہی تمھارے اس ہنگامہ پرور
عزم کی اطلاع ملی کہ تم سودیہ عربیہ جا رہے ہو۔ سچ پوچھ میں تو دھوکا کھا گیا۔ "کیا
حج کرنے۔ خدا بخشے بہت سی "خوبیاں" تھیں۔ آہ کتنی نوعمری میں نو سو چوہوں
کا کوٹہ پورا ہو گیا۔ کہیں یہ بمبئی کی آب و ہوا کا اثر تو نہیں۔ لیکن نہیں تم تیل کے
چشموں میں ملازمت کے لئے جا رہے تھے۔ اس پر "جعفری اولاد" اپنے مخصوص طنزیہ
انداز میں چہچہا کہ یہ تمھارا ایک اور اسٹنٹ ہے۔ اور "بابلی" کی حالت یہ خبر سن کر یوں
سمجھو " وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے" کی سی ہو گئی۔ اور اب تازہ خبر ہے
لیکن اس کی اشاعت میں اتنی احتیاط برتی گئی ہے کہ کہیں اسے ثقہ حضرات سن نہ پائیں۔
زیر لب کہی گئی تھی۔ میرا بھی فرض تھا اسے اور پھیلنے سے روکوں اس لئے جوں کی توں ڈلیور کر رہا
ہوں۔ وصول یابی کی رسید ضرور دینا۔ ممکن ہے میرے پاس رہ جائے تو کسی اور کے کان
میں اس کی بھنک پڑ جائے۔ اصل میں مجھے خوف ہے تو صرف "اصلاح المسلمین" کا
کہ بظاہر تم کان کھول کر سنو یا نہ سنو وہ تمھارے کان کے قریب اس زور سے چلائیگا کہ
تمھاری ہستی دنیا والوں کے لئے نمونۂ عبرت بن جائے گی اور آخر میں تم فرور جیب جلکر
مسلمان بننے پر راضی ہو جاؤ گے"۔ اور شاید اسی لالچ کے مارے غالب کے انداز میں تم معذرت
بھی کر چکے تھے کہ " ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق۔ واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں"
معاملہ مال کے ہونے یا نہ ہونے کا نہیں ہے۔ غور کرنے کا ہے۔ کیونکہ غالب تمام عمر جیل

سے رہائی کے بعد متاسف رہا۔ کیا میں اس کی توقع رکھوں کہ تم پوری طرح سے اخلاقی طور پر دیوالیہ نہیں ہو جاؤ گے۔

بہت دنوں سے تمہاری طبیعت کے اس انحراف کو میں دیکھ رہا ہوں۔ بمبئی جانے سے پہلے بھی تم جس کردار کا مظاہرہ کر رہے تھے ہم لوگ تو خیر ہنس ہنس کر برداشت کر لیتے لیکن ذرا اونچے مزاج کے آدمی تمہارے اس چھچھورے پن پر منہ بناتے۔ خواہ مخواہ تعطل پیدا ہوتا۔ اس کا تمہیں احساس دلانے کے لئے "پیارے" نے تمہیں اس روز اتنے پُر لطف انداز میں دھر لیا تھا کہ تمام ہنس پڑے اور تم چونک گئے۔ ہم تمام دوست ہوٹل میں بیٹھے چائے کا آرڈر دے چکے تھے۔ سب اپنی اپنی پلیٹ سے "کھارا" کھا رہے تھے تم اپنی پلیٹ صاف کر کے دوسروں کی پلیٹوں پر جھپٹا مارنے لگے۔ پھر جب چائے آئی تو تم نے اپنی چائے دو چار گھونٹوں میں ختم کی اور پیارے کے کپ پر ہاتھ مارا۔ مگر وہ اس شرط پر چائے دینے پر راضی ہوا کہ تم کو ایک قطرہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ تم تیار تو تھے ہی۔ پیارے نے ٹیبل کے بیچوں بیچ ساسر کو چائے سے لبالب بھر دیا۔ اگر تم ذرا بھی منہ تک ساسر لے جانے کے لئے اٹھاتے تو چائے گر جاتی۔ ایک لمحہ تم سوچتے رہ گئے اور تمہاری اس بے بسی پر ہم سب ہنس پڑے۔ اور تم بدحواس ہو کر ساسر کو ٹیبل پر ہی رکھے بھینس کی طرح سپڑ سپڑ چائے پینے پر مجبور ہو گئے۔ گھوم پھر کر مکان لوٹتے وقت ہم دو ہی تھے۔ تم نے بڑے دردناک لہجے میں بتایا کہ دوستوں سے الگ ہو کر تم دکھوں ہی دکھوں میں گھر جاتے ہو۔ گھر پر تمہیں ہر کوئی کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہے۔ "کچھ لائے" ایک لمحے کی مسرت اجسم ڈھانپنے کے لئے کپڑا اور پیٹ کی آگ بجھانے کا سر و سامان۔ تم ان کا جواب دینے سے معذور ہو کر اپنی ذہنی رفعت سے قلابازیاں کھاتے ہوئے انتہائی پستی میں آرہے ہو۔ پھر یہ تمہارا معمول سا ہو گیا تھا کہ ماں کو طعنے دیکر، بیوی کو پیٹ

کر اور بچوں کو ڈرا دھمکا کر خاموش کرتے۔

یوں تو ہر بمبئی سے آنے والے دوست کی زبانی تمہارے سلام و پیام ملتے رہتے ہیں۔ خصوصاً میرے زکام کا حال معلوم کرنے کی تمہیں زیادہ فکر رہتی ہے۔ اللہ پاک کی مہربانی ہے کہ مجھے صرف زکام ہی ہوتا ہے۔ ورنہ کوئی ایسی ویسی بیماری لاحق ہوتی تو خواہ مخواہ تیمار داری کے فرائض انجام دینے تمہیں بھی آنا پڑتا۔ احباب کا حال تم پوچھتے ہو اور میری ہمت نہیں پڑتی کہ فرداً فرداً ان تمام کا حال لکھوں۔ نہیں معلوم ان مختلف الطبع انسانوں کو دوست بنانے میں تم نے اپنی عمر اور ذہانت کا کتنا حصہ صرف کیا ہوگا۔ یہ مولوی، یہ آرٹسٹ یہ حجام، یہ لیڈر، یہ شاعر، یہ ادیب، یہ مزدور، یہ گھٹیے، یہ اداکار، یہ بیکار دبے روزگار مگر کمال تو یہی ہے کہ سبھی تمہاری قابلیت کے معترف و مداح۔ اصل میں ان سب کو مار رکھنا تمہارا ہی کام تھا۔ البتہ "مولانا عبدالگرٹپ" کو تم سے جو ضد سی ہوگئی تھی تو راہ چلتے، لائبریری میں، اپنی دوکان پر جہاں کبھی موقع ملے وہ تم سے بحث کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ ایک دفعہ دوران بحث تم نے خدا کی ہستی سے انکار کیا گیا تھا۔ مولانا شاید سمجھے تھے کہ خود انہی کی ہستی سے انکار کیا گیا ہے۔ بیچارے مولانا نے شاید تمہیں ہی صراطِ مستقیم دکھانے کے لئے دستار فضیلت حاصل کی تھی۔ اتفاق سے انہی کی دوکان پر ایک کمیونسٹ سے بحث چھڑ گئی۔ موضوع وہی تھا۔ مگر اس وقت تم اتنے بڑے موحد بن گئے اور خدا کی ہستی کے ثبوت میں دلیلیں جو پیش کرنے لگے تو مولانا ہکا بکا رہ گئے اور جب وہ امتحاناً تمہاری پچھلی باتوں کو یاد دلا کر موجودہ باتوں کی مزید تصدیق چاہی تو تم نے بڑی معصومیت کے ساتھ کہا تھا۔ "بے شک میں نے خدا کی ہستی سے انکار کیا تھا مگر مولانا یہ بتائیے اللہ تعالیٰ کی ہستی سے کبھی انکار کیا ہے۔" گم ہوتے ہوئے حواس کو سمیٹتے ہوئے مولانا نے وضاحت چاہی۔ جس پر تم نے انہیں اور بوکھلا دیا۔ "دیکھئے

قبلہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے قرآن پر میرا ایمان ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ قرآن میں مذکور اللہ تبارک تعالیٰ کے ننانوے ناموں میں "خدا" شامل نہیں ہے"۔ مطلب تمہارا صاف تھا کہ محض فارسی زبان کے خدا، ہندی کے بھگوان، انگریزی کے گاڈ کے وجود سے انکار تمہارا مقصود ہے۔ ورنہ تم اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا سچے دل سے اقرار کرتے ہو۔ میں سمجھتا ہوں یہی وہ حربہ تھا جس کی وجہ سے تم سے ہر ایک مرعوب تھا۔ کاش اس چمکیلی ذہانت اور دل غریب لچھے دار باتوں سے تم اپنی زندگی سنوارنے میں مدد لیتے۔ وہ زمانہ کتنا شاندار تھا جبکہ تم میوزیکل اسٹور کے پارٹنر تھے۔ بازار کے بیچ جدید انداز میں سجا ہوا تمہارا یہ اسٹور رنگین قمقموں سے بقعۂ نور بنا ہوا۔ ریڈیو سیٹ اور گراموفون کے نئے نئے ماڈل عظیم آرٹسٹوں کے فوٹو، ریکارڈ کمپنیوں کے خیال انگیز اشتہارات، ریکارڈوں سے بھری ہوئی الماریاں اور نیڈلس کی رنگ برنگی ڈبیاں، یہ سب کچھ ایسی نفاست سے ترتیب دئے ہوئے ہوتے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صرف زیبائش کے لئے رکھے گئے ہیں۔ خوش پوش گاہکوں کے بیچ ان کی فرمائشوں کو خوش آمدید کہتے ہوئے تمہاری مسرت زا نقل وحرکت دوکان میں ایک رونق سی پیدا کر دیتی۔ اس پر قیمتی مائک سے ابھرتی ہوئی استاد فیاض خان کی گرجدار لہریں۔ اگر بتی کے دھوئیں کی طرح فضا میں پھیلتی تحلیل ہوتی ہوئی خان عبد الکریم خان کی سریلی دھنیں، روشن آرا کی روشن تانیں، بس۔ "آدمی کثرتِ انوار سے حیراں ہو جائے"۔ لیکن تمہاری کریم النفسی ملاحظہ ہو کہ تم اپنے پارٹنر سے ایسا دھوکا کھائے کہ تمہاری زندگی ایک مستقل المیہ بن کر رہ گئی۔

اس حادثہ میں تمہارا وہ سارا اثاثہ تلف ہو گیا جو تمہیں ابن سلطان ہونے کی حیثیت سے ورثہ میں ملا تھا۔ پھر تمہارے لئے سوائے ملازمت کے اور کوئی چارہ کار نہ رہ گیا اور ملازمت بھی تم نے وہ ڈھونڈی کہ بخدا سچ مانو، مجھ سے میرا تصور بھی مذاق کرتا

رہتا تھا کہ تم سویرے ہی سائیکل پر انڈوں کی ٹوکری رکھے گلی گلی، گھر گھر انڈے تقسیم کرتے پھر رہے ہو۔ ریڈ روڈ آئیلینڈ، وہائٹ لیگ ہارن، بلاک منارکہ، تڑکی، دیسی مرغیوں کے رنگ برنگی انڈے، بھورے، گیہوں، سفید انڈے۔ لیکن جب مالک کو معلوم ہوتا ہے کہ تم بھلی چنگی مرغیوں کو کسی بیماری کا شکار بتا کر اس بے دردی سے آپریشن کر ڈالتے ہو کہ بیچاری مرغی اناللہ ہونے کے قریب پہنچ جاتی ہے تو تم اسے حلال کر ڈالتے ہو۔ پھر اس مرغی کا کیا کیا جاتا ہے پتہ نہیں چلتا تو وہ تمہیں نوکری سے برطرف کر دیتا ہے۔

اس کے بعد تم نے روزگار کے حصول میں وہ سب کچھ کیا جو ایک بیروزگار کر سکتا ہے۔ پچاس روپے ماہانہ پر ایک گھٹیا صابون کمپنی کے سیلز مین بنے، پریس میں پروف ریڈر کی نوکری کی، جلاوطنی کی دلالی کی، دوائیاں بیچتے رہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا تھا تمہارے حصہ کا بمبئی کا دانہ پانی اٹھ چکا تھا۔ کم تنخواہ والی ان ناپسندیدہ ملازمتوں سے تنگ آکر ناچار تمہیں بمبئی چلا جانا ہی بہتر معلوم ہوا۔ بمبئی جاتے وقت تم نے کہا تھا۔ میں تمہارے گھر کا خیال رکھوں۔ دو چار مرتبہ سے زیادہ میں تمہارے کہنے پر عمل نہ کر سکا۔ اس لئے کہ تمہارے سونے کے کمرے میں بچھی ہوئی پرانی کرسیاں، کمرے کی آدھی جگہ گھیرا ہوا میز اور مشرقی دیوار پر تمہارا جھاڑ جھنکار ڈاڑھی کا فوٹو پونچھ پانچھ کر سب اس قابل بنائے گئے تھے کہ کوئی دیکھ کر دہشت زدہ نہ ہو جائے۔ چھت سے لٹکتے ہوئے مکڑی کے جالے صاف تھے۔ دیواروں پر اودھم مچاتے رہنے والے سائے غائب تھے۔ ماحول میں ایک گوارہ زندگی گذارنے کی خوشی تھی۔ سمدولت تھی۔ یہ دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ چھوٹی چھوٹی تفصیلات کیا اس بات کی چغلی نہیں کھاتیں کہ تمہیں ویرانی زیادہ پسند تھی۔ لاپرواہی اور بے ترتیبی میں تمہیں سکون ملتا تھا۔ تم الّو کے پٹھے تھے۔

اب تم کہو گے۔ بس جی بس۔ دیکھ لی تمہاری شرافت۔ اتنے دن بعد جو لکھنے

کا خیال پیدا ہوا بھی تو لگے گالیاں دینے۔ کیا دو بول ہمدردی کے بھی نہ تھے۔ تو عرض ہے۔ تم جانتے ہی ہو میں بزدل جو ٹھہرا۔ اصل میں مجھے چاہئے تھا کہ گالیاں اس کو دوں جو تمہارے اور میرے درمیان یہ مکانی بعد پیدا کیا۔ ہاں اسی بات کو تو۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے وہ کون ہے۔ علاوہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ پچھلے زمانے میں لوگ قحط، جنگ، یا عتابِ خسروانہ کے مرتکب ہو کر غریب الوطنی کی خاک چھاننے پر مجبور ہوتے تھے اور آج یعنی بیسویں صدی میں بھی ہم اس منحوس روایت کو اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ صاف ظاہر ہے۔ ان مطلق العنان بادشاہوں اور موجودہ نام نہاد جمہوریتوں میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ کس نظامِ حکومت کو موردِ الزام قرار دوں کس کو قصوروار ٹھہراؤں۔ کس فردِ واحد کو دوش دوں۔ واقعہ سخت ہے اور جان عزیز۔ اس لئے مجھے معاف کر دینا۔ برا نہ ماننا میری باتوں کا۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تمہیں اپنے دوستوں سے ابھی تک دلچسپی باقی ہے۔ حالانکہ تمہاری زندگی کے آسمان پر مصیبتیں ساون کی بدلیوں کی طرح چھائی ہوئی ہیں۔ یہ سچ ہے وہ تابدار نیلا ہٹیں ان گدلی چادروں میں آنکھوں سے اوجھل تو ہو سکتی ہیں مگر مٹ نہیں سکتیں۔ بالکل تمہاری طرح تمہارے قریبی دوستوں کی بھی حالت ہے۔ مطلب یہ کہ وہ بھی تمہیں یاد کرتے رہتے ہیں۔ کوئی دن خالی نہیں جاتا جس دن تمہارے ذکر سے گل بوٹے نہ کھلائے جائیں۔ میری ان غم آمیز باتوں سے کہیں یہ کلیہ قائم نہ کر لینا کہ آدمی مصیبت ہی میں آدمی کو یاد کرتا ہے۔ ایسی مجہول یاد کس کام کی جس میں انسانی قدروں کے ارتقاء کی تکمیل نہ ہوتی ہو۔ تم میری مصیبت میں مدد کرنا چاہو، مگر کر نہ سکو۔ اس سے زیادہ شریفانہ جذبات کی اور کیا توہین ہو سکتی ہے۔ سرمایہ دارانہ اخلاق کی زد میں ہم اور تم ایسی مجہول یاد کے لئے ہی مجبور ہیں۔

اب بھی اگر کچھ اپنے دوستوں کی حالت معلوم کرنے کا تم میں یارا ہے۔ تو سنو۔

"بابلی" کا بنیان فیکٹری کا کام چھوٹ گیا ہے۔ بظاہر اسے حصولِ معاش کی زیادہ فکر نہیں معلوم ہوتی۔ چنانچہ جب ماں کی گالیاں شدت اختیار کرتی ہیں تو وہ انتقاماً بیمار پڑ جاتا ہے۔ یا دوستوں کے سامنے اپنی شومئ قسمت کا رونا روتا رہتا ہے۔ لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ جب کوئی سخی داتا رحم کھا کر اسکے غم کو چائے کے کپ میں غرق کر دیتا ہے تو وہ یوں چہکنے لگتا ہے جیسے بمبئی کا ٹکٹ کٹا چکا ہو۔ اس کی موہ لینے والی آواز کی یاد تمہیں بمبئی کی پر شور زندگی میں بھی ایک دو لمحے تنہائی کی طرف لے جاتی ہوگی۔ ایسی تنہائی جس میں محبوب کی معیت حاصل ہو اور اس خوشی میں ساری دنیا کو نہال کر دینے کا خیال پیدا ہو۔ وہ غزل کا بہترین مغنی بنا۔ یہی اس کی برائی تھی۔ چنانچہ وہ ریڈیو آرٹسٹ ہونے کے باوجود ریڈیو والے اسے موقع نہیں دیتے۔ یہ اردو دشمنی ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ آج ذلیل و خوار ہے۔

"اصلاح المسلمین" کو سارا دن کارخانے میں لوہا گرم کرتے گذارنے کے بعد اتنی فرصت نہیں ملتی کہ وہ اپنے طبلے کا تشنہ پن رفع کر سکے۔ اس کے لئے تو اسے پیٹ پر پتھر باندھنا پڑیگا۔ پیٹ پر پتھر باندھا نہیں جا سکتا۔ اس لئے اس نے طبلے کو رومال میں باندھ کر کھونٹی پر ٹانگ دیا ہے۔ وہ اب بھی تمہیں بڑی فصیح گالیاں دیتا ہے۔ ذلیل القدر۔ چھیچھوری وغیرہ وغیرہ۔

"جعفر کی اولاد" اور تمہارے درمیان سلسلۂ مراسلت تو جاری ہے۔ نیز وہ بمبئی کئی مرتبہ ہو آیا ہے۔ پھر کوئی بات اس کی تم سے چھپی نہ ہوگی۔ البتہ اس کی یہ عادت ابھی تک جاری ہے کہ وہ لائبریری کے اخبارات و رسائل کے پلندے بغل میں داب کر یوں مکان لے جاتا ہے جیسے کہ اسے کل ہی امتحان دینا ہے نہیں معلوم اس کی یہ لسنڈی کب تک جاری رہے گی اور کب نتیجہ نکلے گا ہم کب اس کی کامیابی کے لڈو کھائیں گے۔ مجھے

اس کی متلون ذہانت سے اب بھی امید ہے۔

سقراط کا مشہور مقولہ ہے نا کہ جس شخص کے خیالات اور عمل میں تضاد ہے اس سے بڑھ کر بدنصیب کوئی نہیں۔ یہی حالت میری ہے۔ پڑھتا ہوں، لکھتا ہوں، انگلیاں چٹخاتا ہوں، ناک صاف کرتا ہوں، سوچتا رہتا ہوں ——— ہاں تو میں نے تمہارے اس پر آشوب ماضی کا ذکر محض اس لئے چھیڑا کہ تم ٹھنڈے دل سے غور کر سکو کہ تم کسی بھی نوکری، کسی بھی پیشے، کسی بھی تجارت میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر ایسا کیوں ہوا۔ تم محنت سے جی چراتے تھے؟ کیا تم میں ذہانت کی کمی تھی؟ یقیناً تم پر ایسے الزام عائد نہیں ہو سکتے۔ تو پھر اس کا ایک ہی جواب ہے کہ سرمایہ داروں کی اس دنیا میں محنت اور ذہانت کامیابی کے ضامن نہیں ہوتے۔ لوٹ کھسوٹ کے اس بازار میں چند ایک ہی کامیاب ہیں۔ جو دولت کے وسائل پر قابض ہو کر انسانی طاقتوں کو سلب کرتے جا رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں ماضی کے ان تجربات پر غور کر کے مستقبل کے اس کارواں میں ہم اور تم مل جائیں۔ جس کا ایک رہبر جیل کی چہار دیواری میں محبوس پکار اٹھا تھا

شبِ ظلم نرغۂ راہزن سے پکارتا ہے کوئی مجھے
میں فرازِ دار سے دیکھ لوں کہیں کاروانِ سحر نہ ہو

کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟

تمہارے جواب کا طالب

نقشی کٹورہ

بیمار روشنی

وہ گھر سے نکل کر کہیں باہر جا رہا تھا۔

"بھیا ـــــ او فرید بھیا" وہ رک گیا۔ عذرا اسے اپنے گھر کے پچھواڑے میں سے آواز دے رہی تھی۔

"ارے ـــــ کب آئیں عذرا۔" اور وہ بیتابانہ عذرا کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ عذرا کی شادی ہونے کے طویل عرصے کے بعد پہلی بار اس سے فرید مل رہا تھا۔ فرید کے گھر کے صحن اور عذرا کے گھر کے پچھواڑے کو ایک دیوار الگ کرتی تھی۔ جو مرمت اور دیکھ ریکھ نہ ہونے کے سبب جگہ جگہ سے گر کر زمین کے برابر ہو چکی تھی۔ اور لوگ بکسانی ادھر ادھر آ جا سکتے تھے۔

فرید عذرا کے سامنے جا کھڑا ہوا ۔ عذرا نے کہا ۔

" میں آج صبح آئی ہوں ۔" اور پھر وہ پوچھنے لگی ۔" خالہ جان کیسی ہیں ۔ تمام لوگ خیریت سے تو ہیں ۔ وہ آج کل کیا کام کر رہا ہے ۔" اور وہ جواب دیتا رہا ۔ باتیں ہوتا رہیں کھوکھلی ، بے مزہ ، تھکا دینے والی ۔ اس دوران اس نے عذرا کے متعلق ایک سوال بھی نہ کیا ۔ وہ اسے گھورتا رہا اور بس ۔

" کہاں جا رہے تھے ؟" شاید عذرا کے سوالات کا خزانہ ختم ہو گیا تھا ۔ اور وہ اب فرید کو جہاں جانا تھا یاد دلا رہی تھی ۔ ایک ہی آدمی کہاں تک باتوں کو طول دے ۔ مزہ تو اس وقت ہے پہلا سوال کرے دوسرا جواب دے ، دوسرا سوال کرے پہلا جواب دے ۔ اس طرح بات سے بات نکلتی ہے ۔ اور ماحول پھیکا نہیں ہوتا ۔ مگر فرید عذرا کے چہرے پر نگاہیں گڑھوئے سوچ رہا تھا کہ عذرا کی ہر حرکت اتنی نمایاں کیوں دکھائی دے رہی ہے ۔

" یوں ہی گھومنے چلا تھا ۔" اس نے جواب دیا ۔ اس کا شک آہستہ آہستہ یقین کی صورت اختیار کرنے لگا ۔ واقعی عذرا کی نسوانیت اب بلا کی جاذب نظر اور کشش انگیز ہو گئی تھی ۔ مگر ایسا کیوں ہوا ۔ شوخ سے شوخ لڑکی بھی سسرال ہو آتی ہے تو اس کے ارد گرد تقدس و معصومیت کا ہالہ سا محسوس ہوتا ہے ۔ اور وہ اپنے آپ کو سمیٹ سمیٹ کر اس ہالہ کے اندر ہی رکھتی ہے ۔

حالانکہ وہ ان دنوں غور و فکر کی الجھنوں سے دور ہی رہتا تھا ۔ مگر اس وقت وہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ۔ اس لئے کہ اسے عذرا کو خوش دیکھ کر ایک دھچکا سا لگا تھا ۔ جس سے ذہن میں لٹکی ہوئی تصویر گر گئی تھی ۔ وہ تصویر جس میں عذرا پچھواڑے دروازے کی دہلیز سے لگ کر کھڑی ہوئی ہولے ہولے اس کی ماں سے باتیں کر رہی تھی ۔ بڑی بوڑھیوں کے سے انداز میں کمر پر ہاتھ رکھے ہوں ہاں میں مشغول اور خوش

دیتی تو صاف معلوم ہوتا کہ اس کے گالوں میں پڑتے ہوئے تبسم کے بھنور اب اتنے واضح نہیں رہے۔

اوّل تو فرید کو گھر سے کون دلچسپی تھی۔ مگر عذرا کی شادی کے بعد اس کو گھر سے بالکل دلچسپی نہ رہی۔ عذرا سے اسے عشق بھی نہ ہوا۔ وہ اس سے ایک حد تک دور ہی رہتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ایک کمہلائی ہوئی دوشیزہ کا اس کی طرف پر امید نظروں سے دیکھنا۔ اُسے نامعلوم سی خوشی بخشتا۔ اس کا جی چاہتا ماں سے مذاق کرے، چھوٹے بھائیوں کو ستائے۔ گدگدائے۔ وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ہائی سکول کا ایک خوددار طالب علم تھا۔ اور اسے اپنا معیار قائم رکھنے کے لئے دن رات محنت کرنی پڑتی تھی۔ اس کے سامنے مستقبل ابھی اتنا واضح اور صاف نہ تھا جس سے وہ دو ٹوک فیصلہ کر سکتا۔ پھر بھی وہ عذرا سے زیادہ گھلنا ملنا اچھا نہیں سمجھتا تھا اس لئے گھبراتا تھا۔ پھر اس نے میٹرک پاس کر لیا اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے اپنے ابّا سے ضد کرنے لگا مگر اسے قطعی جواب ملا کہ وہ اس خیال کو ذہن سے نکال دے۔ وہ کہتے تھے کہ یہیں تک بڑھانے میں ہی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو گیا۔ اور سچ بھی تھا کہ فرید کے ابّا بالکل مجبور تھے۔ ان کے پاس اب رکھا ہی کیا تھا۔ بیوی کے تن پر دو چار چاندی کے گہنے ایک دو اچھے کپڑے، ٹوٹے پھوٹے تانبے پیتل کے بغیر قلعی شدہ برتن۔ اور اپنے باپ دادا کی یادگار ایک مکان اور یہ سب رہن ہو چکے تھے یا بک چکے تھے۔ فرید زیادہ ضد کرتا تو کس امید پر؟ اُسے اپنی امنگوں کو خیرباد کہنا پڑا۔

پھر اس نے سیدھے منہ ابّا کے کہنے کے مطابق ملازمت ڈھونڈنی شروع کر دی۔ اسی میں ان کی نجات تھی نا۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ گورنمنٹ کو کلرکوں کی ضرورت تھی۔ مل مالکوں اور کارخانہ داروں کو مزدوروں کو۔ ملک کو بہادر سپاہیوں کی۔

گویا جنگ بھی ایک بڑی "ضرورت" بن کر دنیا پر نازل ہوئی تھی اور فرید بھی ایک ضرورتمند تھا۔ لہٰذا اسے ملازمت مل گئی۔ وہ راشننگ آفس میں کلرک ہو گیا۔ اس طرح وہ بوڑھے ماں باپ اور چھ بہن بھائیوں کا سہارا تو بن گیا۔ مگر اس کے بدلے میں اسے اپنی صحت اور خودداری کو رجسٹروں اور افسروں کے بھینٹ چڑھا دینا پڑا۔ مگر رفتہ رفتہ بلیک مارکیٹ کی بخشی ہوئی ساہوکاری نے اس کی صحت اور خودداری کی تلافی کر دی۔ لیکن ستم یہ تھا کہ ابّا اسے جانور ہی بنا کر چھوڑنے پر مُصر تھے۔ بھلا یہ گھر کا سارا بوجھ روٹی، کپڑا دوا دارو، فیس اس اکیلی جان سے کیسے اٹھایا جا سکتا۔ اس کے خیال میں اس کو انسان نہیں تو کم از کم آدمی ہی بنا رہنا چاہیئے۔ اسے خاندان کی ضرورتوں کے پیش نظر لدو جانور ہی بننے پر مجبور ہونا پڑیگا۔ وہ پریشان تھا کہ یا خدا نے کو جائے کوئی، لوٹا پکڑے وہ۔

ایسے حالات میں اس کی طبیعت کو کچھ سکون ملتا تھا تو عذرا سے۔ بیچاری وہ بھی سات برس سے جوانی کی تغیر طلب راتوں میں اپنے محبوب کا انتظار کرتے کرتے تھک سی گئی تھی۔ وہی محبوب جس کو ماں باپ ٹھونک بجا کر دیکھتے ہیں۔ اور قیمت باندھ کر اپنی بیٹی کو ایک روز اس کے ساتھ رخصت کر دیتے ہیں۔ اور وہی زہریلا ڈنک اس کے دل پر مارتا تھا کہ وہ کس روز سہرا باندھ کر آئیگا۔ یہ انتظار کچھ کم جان لیوا نہیں ہوتا گلاب سی لڑکیوں کو برسوں کا مریض بنا دیتا ہے۔ مگر عذرا کو چاہیئے تھا کہ یوں اداس اداس پڑے رہنے کی بجائے وہی کسی کو ٹھونک بجا کر دیکھ لیتی۔ ماں باپ کے محبوب کا وہ کب تک انتظار کر سکتی تھی اور وہ فرید کے ساتھ ایک عرصہ سے وہی کر رہی تھی۔ فرید اب ڈھنگ سے سوچ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ لیکن عذرا کی شادی ہو گئی — اور آج اس عذرا کو دیکھ کر آہ نکل گئی کہ اس کی بہاروں میں کتنے گل بوٹے نکل آئے ہیں۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ ابّا کے دکھلائے ہوئے راستے پر چلیں۔ ابّا کا راستہ بھی کوئی بُرا تو نہیں ہے۔ مگر ان کی

رہنمائی قبول کرنے سے جی گھبراتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ ان کے خیالات و نظریات زنگ آلود و فرسودہ ہیں بلکہ انہیں غصہ بہت جلد آجاتا ہے اور چیختے بہت ہیں۔ بالکل اس اندھے بھکاری کی طرح جو راہگیروں کی آہٹ پاتے ہی گلا پھاڑ پھاڑ کر دعائیں دیتا ہو۔ چاہے کوئی دھیلا دمڑی اس کے کٹورے میں ڈالے نہ ڈالے۔ فرق صرف اتنا کہ فقیر چیخ چیخ کر دعائیں دیتا ہے۔ ابا چیخ چیخ کر گالیاں دیتے ہیں۔ مگر کہتے ہیں ماں باپ کی ڈانٹ ڈپٹ، مار پیٹ اولاد کی بھلائی کے لئے ہوتی ہے۔ گویا یہ بھی دعائیں ہوئیں۔ مگر یہ گھڑکیاں بھی عذرا کے طفیل ہی تو ملتی تھیں۔ وہ اسے دیکھ کر ذرا مسکرائی۔ پھر اس کی بیہودگیوں کی انتہا نہ رہی۔ سنتے ہیں انسان خاموش اور تنہائی پسند ہو جائے تو کامل بن جائے، اور ابا بھی کہتے ہیں کم کھانا، کم سونا، کم باتیں کرنا۔ یہی گن ہیں خدا کے دوستوں کے۔

فرید ذہنی طور پر ابا سے سمجھوتہ کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ عذرا کی اس تبدیلی سے ناراض تھا کہ آدمی شادی ہونے کے بعد ایکدم کیسے بدل جاتا ہے۔ مگر عذرا بیر کے درخت کی ڈالیوں کی، کالے شہتوتوں کے موسم کی، املی کے درخت پر چیلوں کے گھونسلوں کی باتیں چھیڑی تھی۔ اور فرید نے دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ اب ابا کے کسی حکم سے انحراف نہیں کریگا۔ پھر اس کے دل میں ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی۔ "کاش اس کے ابا اس وقت آجاتے"۔ اور عذرا کو اس حالت میں بے تکلف و بے تکان ہنستے باتیں کرتے دیکھ کر ناراض ہو جاتے۔ پھر وہ انہیں سمجھاتا۔ "ابا آپ خواہ مخواہ بددل ہو رہے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ انسان موقع ملنے پر کیا نہیں کرتا۔ یہ آپ کی سمجھ کا پھیر ہے آپ کہتے چلے آئے ہیں "وہ بڑی پیاری بچی ہے"۔ ایسا ہوتا ہی ہے۔ کون دھوکا نہیں کھاتا غصہ تھوک دیجئے۔ چلئے عذرا سے ملاقات کر لیجئے۔" ابا اب اسے پیچ سے پیچ سمجھیں

اس کی پرواہ نہ تھی۔ مگر اس کی خواہش تھی کہ عذرا بھی اسی کی صف میں گنی جائے۔ مگر کیا وہ اس طرح ابا سے کہہ سکے گا۔ پھر ابا کے اچانک آجانے کے تصور نے اس کے بدن میں سنسنی پیدا کر دی۔ نہیں معلوم وہ ابا کے سامنے بات کیوں نہیں کر سکتا تھا۔ ان کا سامنا ہوتے ہی وہ مرعوب ہو جاتا۔ اسے لڑکپن کا ایک واقعہ یاد آیا۔ جب اس کی عمر سات آٹھ سال کی تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ اور شام کا سرمئی دھندلکا آہستہ آہستہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ ٹھنڈی اور خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ وہ مسجد کے صحن میں گیند کھیل رہا تھا۔ اسے بڑی خوشی محسوس ہو رہی تھی اور وہ آس پاس سے بے خبر کھیل میں بری طرح مشغول تھا اور اس عالم میں نہ جانے کتنی چیخیں کتنے قہقہے لگا چکا تھا اور مسجد میں ابا امامت کر رہے تھے۔ فرض نماز ختم ہونے کی دیر تھی۔ وہ دعا مانگے بغیر مصلے پر سے لپکے۔

"بے سور۔۔۔ ٹھہر۔" ان کی ڈانٹ سنی تھی۔ اس کے ہوش ٹھکانے آگئے وہ بے تحاشا بھاگا۔ اور سیدھے گھر جا کر ماں سے لپٹ گیا۔ ابا پیچھا کرتے جب مکان پر آئے تو اسے ماں کی گود میں لیے دیکھ کر لاٹھی اٹھائی اور بازپرس شروع کر دی۔ وہ اور مضبوطی سے چمٹ گیا اور اس کی ماں دونوں ہاتھوں سے اسے چھپانے لگیں۔ ابا کا غصہ اور تیز ہو گیا وہ اس کا بازو پکڑ کر کھینچنے لگے۔

"چھوڑ دو اسے۔ بہت شرارت کرتا ہے بدمعاش۔ چھوڑ دو۔۔۔ میں کہتا ہوں چھوڑ دو۔"

"کیا کیا ہے اس نے۔۔۔ بچہ ہی تو ہے۔۔۔ چھوڑیے بھی۔۔۔ دیوانے ہو گئے ہو کیا۔" ان سے ماں کے سر پر لاٹھی پڑی۔ ان کے منہ سے دردناک چیخ نکل گئی۔ وہ چکرا گئیں اور زمین پر آ رہیں۔ ابا ایک لمحے کے لئے ٹھٹکے۔ پھر لاٹھی پھینک

کر دندناتے باہر نکل گئے۔ ماں کو بے سدھ پڑے دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ اسے محسوس ہوا اس کی ازار بھیگ گئی ہے۔ اور وہ رانوں کو لپ لپ مارتی ازار پہنے ہی باہر کو بھاگ گیا۔ وہ اتنا سہما ہوا تھا کہ ازار کھولنا بلکہ ساری ضرورتیں بھول گیا۔ اور پائیدانوں پر بیٹھا ہی بیٹھا رہا۔ آخر جب وہ ایسے ہی اٹھ کر چلا آیا تو مکان میں پاس پڑوس کی عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔ اور ان کی ماں بیچ میں لیٹے لیٹے کراہ رہی تھیں۔ ان کا سر پھٹ گیا تھا اور عورتیں زخم پر پٹی باندھ رہی تھیں۔ اور ابا آنگن میں ٹہل رہے تھے۔ اسے بہت برا محسوس ہوا وہ ایک کونے میں دبک کر خاموش آنسو بہاتا رہا۔ یہ واقعہ اس کے دل و دماغ کو اتنا متاثر کر گیا کہ اس نے کھیلنا کودنا ترک کر دیا۔ اس کے ابا بھی پھر کبھی ایسی کوئی حرکت نہ کر سکے۔ مگر ابھی تک ابا سے اس کا رویہ روٹھا ہوا سا تھا۔

"گھومنے نہیں جاؤ گے؟" فرید کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔

"ہاں تو — کیوں نہیں — مگر" وہ گردن پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "واہ یہ بھی خوب رہی۔ گھر میں مہمان آئیں اور میں گھومنے جاؤں؟" وہ اپنے آپ پر بھروسہ کرتے ہوئے تھوڑا سا ہنس پڑا۔ اور پھر اسے محسوس ہوا۔ عذرا جیسے اس کی اس بیہودہ اور روایات از خود رفتگی سے اکتا گئی ہے۔ اور وہ آہستہ آہستہ بے تکلفی برتنے لگا۔ مگر عذرا کو عذر تھا کہ وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتی۔ اسے ایک شادی میں شرکت کرنی تھی۔ اماں جان کو لینے آئی تھی۔ اور فرید سوچ رہا تھا۔ بہت دن بعد ملاقات ہوئی ہے۔ پچھلی ساری کسر نکل جائے گی۔ اور بھی چند ایسی ملاقاتیں میسر ہونگی۔ شادی سے مراد یہ نہیں ہے کہ بیوی ساری عمر میاں کے گھر پر ہی گذار دے۔

"تو تم جاؤ گی ہی۔ ذرا یہ تو خیال کرنا عذرا کہ پورے ایک سال بعد آئی ہو۔"

"ارے — کچھ نہیں تو اپنے نئے گھر کی تو کچھ سناتی جاؤ۔"

"دعا ہے تمہاری" وہ جھینپی نہیں۔ فرید کا خیال تھا وہ رسمی طور پر تو ضرور شرمائے گی۔ اور وہ خوب چٹکیاں لے گا۔ اب اس چہکتی فضا میں پھر ٹھہراؤ پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔" اوں ہوں۔۔۔ مت کہو۔ یہی نا کہ ہم کون ہوتے ہیں پوچھنے والے۔ مگر یاد رکھو یہ بھی ہماری دعاؤں کا طفیل ہے۔ جو آج تم اتنی خوش نظر آ رہی ہو۔ ورنہ ساری عمر کنواری بیٹھی رہتیں۔"

"بڑے تیس مار خاں بن رہے ہو۔" سچ بھی ہے۔ یہ حضرت بھنور شاہ ولی کی دعاؤں کا طفیل ہے۔ ان کی مہربانی ہے۔ عذرا کی مانگ بھری۔ منت جو مانی تھی ان سے۔ مگر فرید مصر تھا کہ اسی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔" تم بھول گئی ہو۔ میں پڑوسی ہونے کی حیثیت سے کہاں تک تمہاری مدد کرتا تھا۔ تم ہم نوجوانوں کو اتنا نکما مت سمجھو۔ پڑوسیوں میں کن لڑکیوں کی شادیاں نہیں ہوئیں۔ اور انہیں کیا دکھ ہے۔ یہ باتیں ہم معلوم کر لیتے ہیں اور پھر ان کی مدد کرنے اور ہر طرح سے تسلی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ نوجوان برادری کا تقاضہ جو ٹھہرا۔" فرید کی آنکھوں میں ایک سنجیدہ شرارت جھانک رہی تھی۔

"اے فرید بکواس بند کر دو اب۔" بھوئیں سکیڑ کر ذرا خفگی کے انداز میں۔

"اچھا صاحب بند کر دی۔ مگر ایک بات ہماری بھی مانو۔ آج ہمارے ساتھ چل کر سینما دیکھ لو۔ واللہ بہت اچھی فلم آئی ہے۔" وہ جیسے اخلاقاً کہا ہو۔

"چھوڑو بھی یہ کیا ذکر چھیڑ رہے ہو۔۔۔ اور ہاں بھیا۔ تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی۔" بالکل ایسے انداز میں جیسے کھویا ہوا کبوتر رخ پہچان گیا ہو۔

"شادی۔ شادی۔ کیا رٹ لگا رکھی ہے تم لوگوں نے۔ ہر کوئی شادی کے متعلق ہی پوچھتا ہے۔ یہ نہیں دیکھتا کہ غریب آدمی ہوں۔ کیسے شادی کر سکتا ہوں

شادی رچانے کے لئے روپے کہاں سے آئیں گے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کون ایسی بہادر لڑکی ہے جو مجھ غریب سے کھلم کھلا شادی پر راضی ہو جائے۔ آخر تم بھی نہیں سمجھتیں۔" عذرا اس سے زیادہ اور بہت کچھ جانتی تھی۔

"کچھ بھی ہو۔ تمہیں شادی کرنی ہوگی۔"

"اب تمہیں کیسے سمجھاؤں — تم نہیں جانتیں — دیکھو! میں اچھے سے اچھا پلاؤ، بہترین قورمہ، نوابی زردہ، شاہی بریانی سبھی کچھ پکا لیتا ہوں۔ اپنی دال روٹی تو پھر معمولی بات ہے۔ بتاؤ کیوں ہزاروں روپیہ شادی پر خرچ کروں۔ ضرورت کیا ہے آخر۔"

"ہائے اللہ۔ یہ کیا ہو گیا ہے آج تمہیں" گھبرا کر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی جیسے کسی کا سہارا ڈھونڈ رہی ہو۔

"چلو جانے دو۔ تم نہیں سمجھو گی۔"

"کیا نہیں سمجھو نگی۔ سیدھا جواب تو دو۔ میں پوچھتی ہوں۔ شادی نہیں کرو گے۔ تم نچ کا کچھ ہانک دیتے ہو۔"

"اچھا بھئی کر لونگا۔ مگر —"

"مگر کیا۔" یکلخت دم سادھ کر

"لڑکی — تم ڈھونڈ دو گی۔"

"ضرور ضرور۔"

اور فرید جیسے ایک لمحے کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔ پھر کہنے لگا۔ "مگر دیکھو۔ ایک میں نے بھی ڈھونڈ رکھی ہے وعدہ کرو۔ یہ راز فاش نہیں ہوگا۔ پھر نام بھی بتا دونگا تمہیں اور اسی سے شادی کروا دینا۔ مزید یہ کہ لڑکی ڈھونڈنے کی تکلیف سے بھی بچ جاؤ گی تم۔"

عذرا کا جواب اثبات میں تھا۔" مگر خفا تو نہیں ہو گی تم"

اب پھر وہ عذرا پر قربان جانے لگا۔ کیوں نہ ہو۔ اب اس کا دماغ اتنی بلندی تک پہنچ گیا تھا کہ رنگین بادلوں کا ایک لامتناہی سلسلہ اس کے نیچے آگیا۔ اور اس کا ٹھکانہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ کیا پتہ اسے۔ شادی بیاہ کی باتیں ایک ریشم سے ملائم بادلوں کا جھولا ہی تو ہے جس میں جھولتے ہوئے سننے والوں اور سنانے والوں کا دماغ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ ایک میٹھا خواب دیکھتے۔ وہ اس بنتی، روٹھتی، بھڑکتی ہوئی عذرا پر نظریں جمائے خیال کرنے لگا۔ جتنی گہرائیاں، نیرنگیاں، پیچیدگیاں اور جان دے دینے کی باتیں عذرا میں ہیں نزہت میں نہیں۔ نزہت ایک بالکل سادہ اور بے مزہ سی لڑکی ہے۔ ایسی شراب جس کے پینے کے بعد نشہ نہیں چڑھتا۔ تاروں بھرے آسمان یا جھومتی ہوئی کالی گھٹاؤں کے آسمان کے برعکس ایکدم سپاٹ جیسے نیلا ہی نیلا آسمان دیکھ رہے ہوں۔ اور جس کی ہستی و نیستی کی ضرورت کا احساس نہ ہوتا ہو۔ وہ تو ایک رحم کا جذبہ تھا کہ بے ماں باپ کی لڑکی ہے۔ بھلا ایسوں کے دکھ درد میں کون کام آسکتا ہے۔ اور وہ ہمت سے کام لیا تھا۔ لوگ کہتے ہیں۔ یہ ملک کی خدمت ہے۔ خدا انہی کاموں سے خوش ہوتا ہے — ہوا کرے۔ اور اس نے نزہت کو فضول سمجھ کر عذرا کی طرف رخ کیا۔ اور اس کے کندھوں پر دونوں ہاتھ رکھ دئے۔ اور پیاری پیاری نظروں سے دیکھنے لگا۔ عذرا گھبرا گئی۔ اس کی بھنوئیں تن گئیں گال پسینے سے تر بتر ہونے لگے۔" یہ دنیا ظالم ہے۔ کہیں بھی اسے چین لینے نہیں دیتی۔" وہ غریب کے دونوں ہاتھوں کو جھٹک کر اپنے گھر میں گھس گئی۔" بدمعاش تیری شادی ہی نہ ہو۔" عذرا کی آنکھیں چیخ رہی تھیں۔

دن بھر آگ برساتا ہوا سورج مکانوں کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ بلند و بالا درختوں کی چوٹیوں پر زرد زرد دھوپ آہستہ آہستہ اوپر کی جانب سرکتی جا رہی تھی۔ گرم ہوائیں لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ اور شام کی بیمار روشنی دم توڑ رہی تھی۔

دہلیز کے باہر

کتنی ہی لڑکیوں سے وہ معاشقہ کرنا چاہا۔ مگر سلسلہ تانک جھانک سے آگے نہ بڑھ سکا۔ عشق و محبت کی کہانیاں سنتے سنتے اس کی جوانی سوکھتی جارہی تھی۔ اور ایسا موقع پیدا نہیں ہو رہا تھا کہ شفق، بہار اور چاندنی کی افادیت کو وہ سمجھ سکے یا ان سے صحیح طور پر لطف اندوز ہو سکے۔ اس کی تنہائی اتنی گرانبار، اتنی ویران ہو گئی تھی کہ دن بدن اس کا یہ خیال پکا ہوتا جا رہا تھا کہ اس پر کوئی لڑکی عاشق نہیں ہو سکتی۔ اس کی شخصیت میں کوئی خاص بات ہی نہیں۔ طور جیسے جذبات کی وہ ساری علویت، وہ ساری لطافت ختم ہو گئی تھی کہ جس سے انسان کو کوئی حسین چیز دیکھ کر پرستش کا خیال آتا ہے اور پھر اس پر سے وارے نیارے ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ تقریباً انہی دنوں نغمی سے وہ واقعہ پیش آیا

جس کی وجہ سے اس کی یاسیت نفرت میں بدل گئی۔

نھنی کی بلاتی ہوئی آنکھیں، گو بجار قہقہے، بے اختیار اچھل کود اور چبھتے ہوئے نقوش سے اس کے جذبات میں آگ لگ جاتی تھی۔ سوائے اس کے اسے سجھائی نہ دیتا تھا کہ اس کی جوانی کو اجاڑ دے، پامال کر دے یا جوتوں تلے رگڑ دے۔ افلاس کی ماری نھنی سے اسے ہمدردی کی بجائے دشمنی ہو گئی تھی کہ کیوں وہ اپنے پھول سے جسم کو ہر ایرے غیرے کے ہاتھ دو چار روپوں میں بیچ ڈالتی ہے۔ اس کی یہی بات اسے کھٹکتی تھی۔ ورنہ وہ اس سے بہت پہلے ہی دل دے بیٹھنے پر تیار ہو سکتا تھا۔

وہ نھنی کو اس کے بچپن سے جانتا تھا۔ جب وہ بھوک کی شدت سے مجبور ان کے مکان میں کسی طرف سہمی ہوئی بیٹھی رہتی اور والدہ کے ہزار پوچھنے پر بھی نہ بتاتی کہ وہ کیوں آئی ہے۔ مگر دن بھر ہلنے کا نام نہ لیتی تو والدہ سمجھ جاتیں اور ترس کھا کر ایک آدھ روٹی کا ٹکڑا یا بچا کھچا کھانا دے کر کسی نہ کسی کام پر لگا دیتیں۔ یہی سبزی ترکاری لانا، برتن بھانڈے مانجھنا، چھوٹی چھوٹی مٹکیوں سے پانی بھرنا۔ کھانا پا کر وہ یہ کام بڑی خوشی سے کرتی تھی۔ اور والدہ کو بھی کیا چاہیئے تھا۔ اس طرح ایک ملازم کی تنخواہ بچ جاتی۔

جب وہ جوان ہوئی تب بھی اس کے برتاؤ میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہ ہوئی روٹی لا کر وہ اب بھی سالن کے لئے ضد کرتی تھی۔ کپڑا لا کر اس کی بہنوں کو بلاؤز سی دینے پر مجبور کرتی اور رعیدوں میں تو وہ اپنے گھر کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھتی۔ میلوں ٹھیلوں کے موسم میں گویا اس کی بہنوں کے گہنے، ساڑھی، برقعہ پر اس کا حقِ ملکیت مسلّم تھا۔ لیکن جب سے اس میں یہ اعتماد پیدا ہو گیا تھا کہ وہ بنا کسی کی مدد کے اپنا پیٹ خود پال سکتی ہے اور کپڑے بنوا سکتی ہے خوش رہ سکتی ہے تو اس میں اوروں سے برابری کرنے کا جذبہ خطرناک حد تک شدید ہو گیا تھا۔ کپڑے پہننے میں، کھانا کھانے میں شیخی بگھارنے میں وہ سبھوں کو پست کر دیتی

اور شاید اسی مقابلے پر کر اس کی بہنیں پردے میں رہتی ہیں۔ وہ اپنے گھر کی چوکھٹ پر بانس کی باریک تیلیوں کی چق لٹکا دی تھی۔

لیکن ادھر والدہ بھی نھی کے ان تکلفات کا مطلب اچھی طرح سمجھتی تھیں انہیں فکر اس بات کی تھی کہ ان کے گھر بھی جوان لڑکیاں ہیں۔ جو آج نہیں کل اونچے گھرانوں میں بیاہی جائیں گی۔ شیطان کے کان بہرے جوان لڑکا ہے گھر میں ایسوں ویسوں کو دیکھ کر شریف خاندان والے انہیں اپنی دہلیز پر قدم بھی رکھنے نہ دیں گے۔ ہاں بیٹا بیٹی کا سوال جو ٹھہرا۔ نھی ان کے گھر نہ آکر موج کرے۔ بھینس کی طرح بیچ غلاظت چاٹتی پھرے۔ انہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو ان لوگوں میں ہوتی ہی آئی ہے۔ چنانچہ انہوں نے پہلے پہل اس سے بے رخی اور اظہار خفگی پر ہی اکتفا کیا مگر اس سے کام بنتا نظر نہ آیا تو پھر نہایت سرد مہری کے ساتھ اس سے کہہ دیا گیا کہ وہ ان کے گھر نہ آئے۔ اس وقت نھی کی آنکھیں بھر آئی تھیں اور بے بس آنسو ٹپ ٹپ گر کر زمین میں یوں جذب ہونے لگے تھے جیسے اسی دن کے لئے یہ آنسو اس نے جمع کر رکھے تھے۔

لسے بڑی خوشی ہوئی کہ نھی کو ایک حد تک اچھی سزا ملی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ نھی کو ان سے اور ان کے گھر سے بہت محبت ہے۔ وہ ضرور تائب ہو جائیگی۔ لیکن جب اس کا کاروبار بند نہ ہو سکا۔ اس کے گاہکوں کی دھوم بدستور قائم رہی۔ تو وہ زہر کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ تب بھی اس نے ہمت نہ ہاری۔ اس کے گھر والوں کو اکساہی دیا۔ لیکن نھی بھی خوب چالاک تھی۔ اس نے اپنے باپ کی مٹھی گرم کر کے اسے مزیدار کھانے کھلا کے اور چاپلوسی چلے سے اپنا طرفدار بنا ہی لیا۔ باپ کا خوف البتہ چند روز تک ماں اور بھائی کو دبا رکھا۔ آخر کب تک! ماں اور بھائی انیچی۔ باپ کو شکست کر گھر کی حکومت پر قابض ہو گئے اور نھی کو بیٹ بیٹ کر پڑی پسلی ایک کرنے لگے۔ چنانچہ وہ پیٹتے رہے، نھی روتی رہی۔ مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

پھر اتفاق سے انہی دنوں ایک دور کے رشتے کے بھائی نہ جانے کیوں ان کے ہاں آن پڑے۔ والدہ بھی تھیں وہ لاوارث ہی تھیں کہ آگے پیچھے کوئی نہیں اور ان کا بچپن انہی کے ہاں گزرا تھا۔ والدہ ان کی آمد پر بہت مسرور ہوئیں۔ مگر ان کی حالت دیکھ کر انہیں افسوس بھی ہوا۔ بھائی صاحب کے جسم پر بڑے بڑے چھالے پڑ گئے تھے۔ ان کی کمر میں طاقت ہی نہ تھی۔ تانگے سے اتر کر سیدھے بستر پر وہ جا لیٹے تو سُدھ بُدھ نہ رہی۔ بخار تھا کہ اترنے کا نام نہ لیتا تھا۔ مگر بہترین سے بہترین علاج اور والدہ کی پر شفقت تیمارداری سے وہ جلد ہی تندرست ہوگئے۔ اور جیسے ہی اس قابل ہوگئے کہ باہر آ جا سکیں۔ تو ان کے لئے گھر میں بیٹھنا ناممکن ہوگیا۔ پرانے بچھڑے ہوئے ساتھیوں کی کشش تھی کہ انہیں پل بھر بھی گھر میں ٹکنے نہ دیتی تھی۔ لہٰذا پرانی صحبتیں دھیرے دھیرے رنگ جمانے لگیں۔ اور وہ بدستور اپنی پرانی دلچسپیوں میں محو ہوگئے۔ جوا، شراب، رنڈی بازی ان کے دلپسند مشغلے تھے۔ پھر ایسے ماحول میں نغمی کی خیر خبر ملنا کوئی ایسی مشکل نہ تھی۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں نغمی ان کے ہاتھوں میں خالی فریم کی طرح آگئی اور انہوں نے اس میں اپنی تصویر جڑ دی۔ جس کا گھر پر پہلا ردِ عمل یہ ہوا کہ والدہ سے ان کا جھگڑا چلنے لگا۔ والدہ سے پڑوسیوں کی حمایت میں وہ کس بے شرمی کے ساتھ کہتے ۔ "یہ بیہودگی ہے کہ پڑوسیوں سے بگاڑ پیدا کر لیا جائے۔ گلی محلے کے لوگوں سے دشمنی کرنا سراسر حماقت ہے۔" تعجب تھا کہ وہ کس صفائی سے والدہ کے سامنے ان کمینے اور نیچ پڑوسیوں کی تعریف کر جاتے تھے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ ان کی ہمدردی کے پیچھے نغمی کا اکساوا کام کر رہا تھا۔ شکر ہے والدہ نے اس کا نوٹس ہی نہ لیا اپنی عادت کے مطابق ناک سے گنگناتے ہوئے ٹہلتی رہیں۔ کئی روز یہ سلسلہ جاری رہا۔ آخر بھائی صاحب نے نغمی کو ان کے گھر آنے کی اجازت دیدی۔ بھائی صاحب کی ان کے گھر میں یہ دست درازی اسے بھی سخت ناگوار گذری اور وہ دیکھ رہا تھا کہ والدہ اس کے خلاف کیا اقدام کرتی ہیں۔ اور وہ مایوس ہوگیا کہ والدہ نے اس مشکل کو حل کرنے میں کچھ زیادہ سمجھداری کا ثبوت نہ دیا۔ یوں تو انہوں

نے رو دھو کر اودھم مچا ڈالا۔ پھر قرابت دار بزرگوں کو بلا کر نصیحتیں کرائیں۔ خاندان کی شرافت کا واسطہ دیا۔ چاند سی دلہن لا دینے کے سبز باغ دکھلائے۔ بھلا یہ بھی کوئی بھائی صاحب کو مرعوب کرنے والی بات ہوئی۔ ان کی تو شرم ہی جلدی گئی تھی۔ البتہ اتنا ہوا کہ اس روز روز کی دانتا کلکل سے بھائی صاحب کا دم الجھنے لگا۔ اور ننھی کا ایک زیور اڑا کر وہ اچانک غائب ہو گئے۔

ننھی کی حیثیت اب گھر کے ایک فرد کی سی تھی۔ گھر میں وہ ہر جگہ دندناتی پھرتی تھی۔ والدہ نے جیسے بیراگ لے لیا تھا۔ ننھی ان کے گھر آتے ہی وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتیں۔ اور گھر میں ایک پراسرار خاموشی طاری ہو جاتی۔ جیسے جوار کی فصل پک کر کھڑی ہو گئی ہو اور کٹائی کا خوف غیر محسوس طور پر اس کے اندر سرسرا رہا ہو۔ والدہ کا چہرہ اور لمبوترہ ہو گیا تھا۔ اور وہ ننھی کے سامنے آنے سے سخت پرہیز کرتیں۔ وہ جلد ہی سمجھ گیا کہ والدہ نے بھائی صاحب کے بھگانے میں جس نسخے کو استعمال کیا تھا وہ اب ننھی کے لئے کارگر ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ ننھی کو والدہ سے جھگڑنے کا ذرا بھی موقع مل جاتا تو وہ زمین آسمان ایک کر ڈالتی۔ کیونکہ اس کے پاس اس گھر پر اپنا حق جتانے کا ایک ناقابلِ انکار ثبوت تھا۔

پھر اس نے اس کا یوں بندوبست کیا کہ ننھی کے بھائی کے کان میں بھی اس کی بھنک پڑ جائے۔ ایک کنواری لڑکی کا حاملہ ہونا پہاڑ برابر گناہ تھا۔ اور اس سے پیدا ہونے والی سماجی اور معاشی پیچیدگیاں وہ الگ تھیں۔ پھر تو اس کا بھائی ننھی پر چھری لے کر ہی چڑھ دوڑا۔ مگر ماں کی ماستا آڑے آئی اور ننھی کو زبردستی دوائی پلائی گئی۔ اور وہ ایک لمبے عرصہ تک کھٹیا پر لیٹی رہی۔

میدان صاف ہو گیا تھا۔ والدہ کو پھر اپنے بچوں کا مستقبل ستانے لگا۔ اور جیسے تیسے انہوں نے لڑکیوں کو ٹھکانے لگانے کے فرض سے سبکدوشی حاصل کر لی۔ ننھی کی مہینوں غیر حاضری سے گویا سب دھوکا کھا گئے تھے۔ مگر وہ مری نہیں۔ تندرست ہوتے ہی شکر کی کٹوری

لئے فاتحہ دلوانے کے بہانے ان کے گھر آگئی۔ اسے دیکھ کر والدہ کی جھرّیاں ایک عجیب تبسم سے چمک اٹھیں جیسے اس کی سخت جانی پر شاباشی دے رہی ہوں۔ نگھی نقاہت کی وجہ سے سفید پڑ گئی تھی۔ اس کا بنیو کا سا رنگ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں ملائمت اور پشیمانی، بول چال میں سادگی اور مصفّا پن آگیا تھا۔ نگھی کو اس قابلِ رحم حالت میں دیکھ کر والدہ بھی دھیمی پڑ گئیں اور اس کے بعد جب بھی وہ آتی تو جانے کا نام نہ لیتی۔ اکثر انہی کے ہاں لیٹ رہتی، کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا جو تھا سو تھا۔ حد ہے وہ اس کی بہنوں کے پرانے کپڑے تک نکال کر پہن لیتی اور والدہ اف تک نہ کرتیں۔ یہ سب دیکھ دیکھ کر اسے سخت وحشت ہوتی تھی۔ اس کے تو سینے میں ایک زمانے سے نفرت کا لاوا اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ نگھی کو وہ جوتوں تلے رگڑ دینا چاہتا تھا۔ اس کی پر غرور جوانی کو جلا دینا چاہتا تھا۔ اور پھر اس نے والدہ سے شکایت بھی کی۔ مگر وہ صاف مکر گئیں کہنے لگیں۔ وہ کہاں کھاتی ہے، وہ کہاں پہنتی ہے۔ جب ذرا اس نے دن وقت وغیرہ کی تفصیل بھی سنائی۔ تو ان کا گلا رُندھ گیا۔ انہیں اپنی بیٹیاں یاد آگئیں۔ جب وہ تھیں تو گھر میں رونق ہی رونق تھی۔ اب اس بھنڈار جیسے گھر میں وہ اکیلی چمگادڑ کی طرح چکر لگاتی پھرتی ہیں۔ جب بہو آجائے گی نا تب وہ اسے قطعی جھڑک دینگی۔ اور اب اس بچی میں ہے ہی کیا؟ وہ تو اب باہر جھانکنا تک پاپ سمجھتی ہے"۔ یا اللہ ــــــ یہ مائیں بھی کیا چیز ہوتی ہیں۔

ذہنی الجھنوں سے بچنے کے لئے وہ اپنا زیادہ وقت باہر گذارنے لگا۔ والدہ کو اس سے بڑی کوفت ہوتی۔ وہ آدھی آدھی رات تک اس کا انتظار کرتیں اور وہ ان کے غصہ اور تکلیف کی پرواہ کئے بغیر چپ چاپ کھاپی کر لیٹ جاتا۔

"بیٹا یہ لچھن شریفوں کے نہیں۔ گھر کو تو تم نے ہوٹل ہی سمجھ رکھا ہے۔ پر مجھ سے

بولتے کیوں نہیں"۔ والدہ آدھے غصے آدھے پیار سے فہمائش کرنے لگیں۔ سیکنڈ شو کے خیال سے وہ ذرا جلد ہی گھر چلا آیا تھا کہ کچھ کھا پی لے۔ ننھی دیوان خانے میں کچھ کر رہی تھی۔ دراصل وہ اس کی طرف دیکھنا تک گوارہ نہ کرتا تھا۔ "بھابی لادو نا چاچی۔ ہوٹل کے گھر بن جانے میں کیا دیر ہے۔"

"اے ری ۔۔۔ میں کہاں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہوں۔ پرسوں ہی تو اپنے تحصیلدار عطاء اللہ کے ہاں گئی تھی۔ پرانا رشتہ ہے کچھ ڈھنگ ۔۔۔۔ اے لو ۔۔۔ بیٹا تم نے تو ایک روٹی بھی نہیں کھائی۔ اور یہ چاول تو ایسے ہی دھرے ہیں۔ ہائے ہائے۔ بیٹا یہ تمھیں ہو کیا گیا ہے۔" وہ ہاتھ دھو کر کندھے پر کوٹ ڈالے لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلا گیا۔ اس پرانے رشتے کی بات سن کر اس کے تو نوالہ اٹک گیا تھا۔ عطاء اللہ خان کی بیٹی بھی کیا بیٹی تھی۔ صحیح معنوں میں وہ اپنے باپ کی جانشین تھی۔ عطاء اللہ خان کو اپنی بیٹی کے رشتہ طے کرنے کی بجائے اسے اپنا خلیفہ بنانا چاہیئے۔ تاکہ جس طرح عالم جوانی میں وہ اپنی پہلوانی کی دھاک بٹھا چکے تھے۔ وہ اس روایت کو برقرار رکھا جا سکے۔ مگر وہ سوچنے لگا۔ یہ ننھی آج اس کے معاملے میں کیوں ٹانگ اڑائی۔ اور شک میں پڑ گیا۔ کیا معلوم وہ ہی والدہ کو عطاء اللہ کی بیٹی کے لئے اکسا رہی ہو اور اسے اسی میں عافیت نظر آئی کہ عطاء اللہ کی بیٹی سے کشتی کی بجائے ننھی کی دوستی ہی بھلی۔ اس سے والدہ کے خیال کو بھی تبدیل کرنے میں مدد مل سکتی تھی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ اتنے سارے ہنگامے ہو چکے تھے۔ مگر اسے ننھی سے گفتگو کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ دراصل وہ ایسا موقع پیدا ہی نہ ہونے دیتا تھا۔ وہ دل کا ایسا کمزور تھا کہ ہمت ہی نہ پڑتی۔ اور اگر ہمت کر جاتا۔ تو بات کو نباہ نہ سکتا تھا۔ پھر وہ ایک دن تنہائی پا کر اسے محض آزمانے کے لئے چھیڑا۔ "ننھی تو کسی سے بیاہ کر کہیں کیوں نہیں چلی جاتی۔"

"آپ ہی کیوں نہیں کر لیتے۔" بجلی کے کوندے کی طرح چمک کر وہ غائب ہوگئی۔ اور اس کے آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ اسے بالکل غیر مسلح کر گئی تھی۔ وہ تو سوچ ہی نہ سکا۔ سمجھ ہی نہ سکا۔ مگر اس کے الفاظ کانوں میں گونجتے رہے۔
"ہاں کیوں نہیں کر لیتے۔ ہاں کیوں نہیں کر لیتے۔" اندھیرا اب صرف اس کے آنکھوں تلے ہی نہ تھا۔ بلکہ دماغ پر بھی تھا۔ اس کے دل کے اندر بھی تھا۔ جسم کے اطراف بھی تھا۔ اور اس اندھیرے میں اس کا وجود ڈوبتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ "کیوں نہیں کر لیتے۔ کیوں نہیں کر لیتے۔" اور اس کی بھوکی پیاسی روح جوانی کے اس اندھیرے میں اس کوندے سے لپٹنے کے لئے بے چین ہو اٹھی۔ "ہاں کر لیتے ہیں۔ کر لیتے ہیں۔" اور وہ اسی رات کو دہلیز کے باہر اس کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا۔ ننھی اس اندھیرے کو بھانپ گئی جو اس کے اطراف رینگ رہا تھا۔ مگر ننھی بجلی ہی تو تھی۔ ایسے گری کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سوکھ گیا۔

ایک شام

بیس پچیس روز کی لگاتار بارش سے راستے کیچڑ سے پٹے پڑے تھے۔ اور اب یہ حال تھا کہ پانچ دس منٹ کے وقفہ سے سروں پر بادل تن جاتے اور ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگتی۔ لوگ چھتریاں لگا لیتے اور پائجامے کے پائنچے اور دھوتیوں کے دامن اوپر کھینچ لیتے۔ بہت سے تو ننگے پیر ننگے سر سینے پر ہاتھ باندھے تیز تیز قدم اٹھانے لگتے۔ بارش کو ابھی تین چار منٹ بھی نہ ہونے پاتے کہ مغرب کی سنسناتی ہوئی ہوا ہر ایک کو کپکپا دیتی۔ بادل اڑ جاتے اور سایہ سی دھوپ آنکھ مچولی کھیلنے لگتی۔ کبھی کبھی سڑکوں پر کاروں کے پہیوں سے اڑتے ہوئے گدلے پانی کی پچکاریاں سفید پوشوں کو نالیوں کی طرف دھکیل دیتیں اور وہ ملامت بار نظروں سے کاروں کو دیکھتے

پچکاریوں کی زد سے اپنے کپڑوں کو بچاتے پریشان ہو جاتے ۔ وہ بھی ان حادثوں سے بیزار بیزار چلے جا رہے تھے ۔ مگر خورشید کے اچانک نظر آتے ہی ان کی سسکتی ہوئی رُوحیں مسکرا اٹھیں ۔ لیکن خورشید بھی چہرے پر سوبل ڈالے ملا ۔ مگر سلامت ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کے بُشرے پر خوشی کے پھول کھلتے دیکھنا چاہتا تھا ۔ سلسلے کے لئے اس نے کچھ رُمان ہی کا سہارا بہتر سمجھا ۔ " بھئی ماجرا کیا ہے ۔ یہ جادو تم پر کیسے چل گیا ۔" خورشید نے گویا بدگمان ہوتے ہوئے پوچھا ۔

" کچھ نہیں دوست ! ــــ آہ یہ کیچڑ ۔ یہ برفیلی ہوائیں ــــ اور ہماری بے بسی " وہ ایک ڈرامائی انداز میں نڈھال ہو گیا ۔

" صاف صاف کہو نا ۔ بیوی بچے یاد آ رہے ہیں ۔" بات چل نکلی تھی ۔ مگر رخ بدل گیا ۔

" اور یہ واقعہ بھی ہے ۔ اتنا خوبصورت گھر ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا ۔ اب علی کی مثال لو ۔ بیچارے کو ہر جمعہ فقیروں سے آنکھوں میں سرمہ لگانے کی عادت کیا ہے وہ سرِ شام بازاروں میں موتیوں کے ہار کی طرح جگمگاتے ہوئے حسین حسین عورتوں کے جمگھٹوں کو دیکھ کر صراطِ مستقیم سے بھٹک نہیں سکتا ۔ اور اپنے ذوقِ نظر کی تسکین کے لئے محض اپنی بیوی ہی کی چھان پھٹک پر اکتفا کرتا ہے ۔" علی کی پر آشوب ازدواجی زندگی کی مثال دے کر قمر نے سلامت پر چوٹ کی تھی ۔

" میں بھی یہی سمجھا رہا ہوں میرے معصوم کنوارو ۔ یہ ارمان انگیز جوانی یوں خوابوں میں مت کھوؤ ۔ جلد کسی دودھیائی کے ہو جاؤ ۔ پھر دیکھو اس زندگی میں کیا کیا مزے ہیں ۔"

" سچ ؟ " قمر نے سلامت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا ۔ گویا سلامت کے تجربہ کی حقیقت اس کے بیان کے بالکل برعکس تھی ۔

"آزما کر دیکھ لو۔ دوستی کے حق میں میں برائی نہیں کرتا۔"

"بتاؤ جی! یہ حضرت کب کسی کے ساتھ بھلائی کر سکتے ہیں۔ ان کی بھلائی کیا ہے۔ ارمانوں بھری ماما سمجھو۔ جس کی وجہ سے کسی ماں نے اپنے لاڈلے بیٹے کی بیس مرتبہ ختنہ کرائی تھی۔"

"اف ہو!" سلامت کانپ اٹھا۔ اب بحث کی گنجائش ہی نہ تھی۔ قمر اور خورشید اندھا دھند قہقہے لگانے لگے۔

"خورشید" چونک کر وہ آواز کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایک نوجوان سائیکل سے قریب قریب کود پڑا۔ اس نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ قمر اور سلامت آگے بڑھ گئے۔

"جانتے ہو تم اسے" خورشید نے واپس آکر ان سے پوچھا۔ اور ان کے جواب کا انتظار کئے بغیر سنانے لگا۔ "بڑا اچھا دوست ہے۔ ایک واقعہ سنو"۔ پھر وہ خاموش ہو گیا "آؤ کسی ہوٹل میں بیٹھیں۔" اور وہ ایک غلیظ ہوٹل کے تاریک کونے میں دھوئیں اور تیل میں بسے ہوئے بینچوں پر بیٹھ گئے۔ ہوٹل میں لوگ بہت کم تھے اور جو تھے۔ وہ اتنے اکیلے اکیلے سمٹے ٹھٹھرے معلوم ہوتے تھے کہ جیسے انہیں دوسروں سے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ تین اسپیشل چائے کا آرڈر دے کر وہ اس قصہ کو چھیڑا جس میں اینٹی کرپشن برانچ انسپکٹر کو دھوکا دیا گیا تھا۔ مگر جس کی یادداشت میں اسے اپنے تبادلے کا پروانہ ملا تھا۔ ہوا یوں کہ انسپکٹر کا آدمی گوا سے سونا اور شراب اسمگل کرتا تھا۔ معمولاً اس کو بھی دو چار روپیہ ملتے تھے۔ لیکن فرض کی ادائیگی کے طور پر کبھی کبھی انسپکٹر، کلرکوں کو پھنسا کر نوکری سے علیحدہ بھی کراتا تھا۔ اور وہ سارے جوڑ توڑ سے خوب آگاہ تھا۔ لیکن اپنی برخواستگی کی باری آنے سے پہلے اس نے انسپکٹر کے آدمی کی ضبطی، برنچ نامہ وغیرہ کر کے باقاعدہ پولیس کے حوالے کر دیا۔

ہوٹل سے نکل کر خورشید بھی چلا گیا۔ اور اب وہ دونوں نے میونسپل گارڈن

کی راہ لی۔ ملکارجن روڈ کی لمبی اور خطرناک اتار پر ایک سائیکل سوار اس تیزی کے ساتھ گذر گیا کہ سلامت گھبرا کر مڑ کر دیکھنے پر مجبور ہو گیا۔ جیسے وہ سائیکل سوار ضرور کوئی حادثہ کر بیٹھے گا۔ لیکن سائیکل سوار کی ٹائی کندھے پر سے ہو کر پیٹھ کی جانب پھڑپھڑا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی رنگین، نازک سا ہاتھ پُر اشتیاق اضطراب سے اسے بائی بائی کر رہا ہو۔ وہ میونسپل گارڈن میں مڑ گئے۔ سرو کے نازک لمبے پیڑوں کی قطار کے سرے پر راستے کے بائیں طرف نیم کا درخت زمین کے ایک کشادہ قطعے پر اپنے ٹھنڈے اور خاموش سایوں سے غنودگی پھیلا رہا تھا۔ ہال کے اندر سے کبھی کبھی چند ملی جُلی آوازوں کا ہلکا سا شور اٹھتا۔ یا یکّا دکّا آدمی اندر یا باہر آتا جاتا دکھائی دیتا۔ باغ میں رنگ برنگی کروٹن کے رنگین پتے ہوا کی طفلانہ شرارت سے ایک دوسرے الجھ رہے تھے۔ گلپوش بیلیں اپنی دوشیزگی کی مہک بکھیر رہی تھیں۔ ہریالی کے قطعوں کی مخملیں طراوت میں تھرتھری بھر گئی تھی۔ مگر حوضوں کے غلیظ پانیوں میں جمی ہوئی کائی پر سکوت طاری تھا۔ فوارے بند تھے۔ یہ تینوں حوض تین بدیسی گورنروں کے اعزاز کی یاد میں بنائے گئے تھے۔ جن میں سے ایک کے بیچوں بیچ لیکھے کو اوپر چوبرج اٹھائے تعمیر کیا گیا تھا اس کا سارا رنگ و روغن جھڑ چکا تھا۔ اب گویا حصے سے اس کا فوارہ بند پڑے رہنے سے بگلا فریاد کر رہا تھا۔ "میرا گلا خشک ہو گیا ہے۔ میرے حلق میں زنگ لگ گیا ہے۔ یا میرے انگریز گورنرو ــــ" اور دوسرے میں مہادیو جی کو تعمیر کیا گیا تھا۔ آسن جمائے۔ آنکھیں موندے پروقار انداز میں۔ مگر جن کے سر پر جمائی ہوئی جٹا سے بہنے والی گنگا ماتا کا امرت بند تھا شاید جانے والا انگریز گورنر اپنے ساتھ ان کے امرت کا خزانہ بھی لوٹ لے گیا تھا۔ تیسرے کا فوارہ نکال کر اس میں ایک چبوترہ بنا کے اس پر ایک زبردست اونچے تھام پر میونسپل کا جھنڈا لہرایا گیا تھا مگر اس پر خدا کی رحمت اتنی برس گئی تھی کہ وہ تھام سے لپٹ گیا تھا۔ شرمایا ہوا تھا کہ میں اس عنایت کے قابل نہیں تھا۔ لوگ یہاں آتے تھے۔ کلرک، طلبا، بیروزگار،

مونگ پھلیاں کھانے، گپیں ہانکنے، تکان اتارنے۔ وہ جھنڈے کے اطراف بچھے ہوئے دائرہ نما بینچوں میں سے راستے کے کنارے کی ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ قمر نے کتاب کھول لی۔ سلامت آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ مغرب سے ابھی دھواں دھواں بادل اٹھ رہے تھے جیسے بھوس میں شعلے اٹھنے سے پہلے گاڑھا گاڑھا دھواں بل کھاتا ہوا فضا میں پھیل جاتا ہے۔ کبھی کبھی مغربی افق سے ان بادلوں کی چادر ذرا کی ذرا چاک ہوتی تو پیلی دھوپ کی پچکاری سی چھوٹتی اور جس سے ان تھکے تھکائے سایوں میں جکڑی ہوئی فضا نکھر جاتی۔ پھر تھوڑی دیر میں شفق بھی کھل گئی۔ اور آسمان بادل اور افق لال، گلابی، زعفرانی رنگوں کے سمندر میں نہا گئے۔ اور ان کا ہلکا سا عکس عمارتوں، درختوں، پودوں اور ان کے اپنے چہروں پر بھی دمکنے لگا۔ ڈوبتے ہوئے سورج نے مغرب میں اپنے رنگ اور ان بادلوں کی مدد سے ایک تصویر بنادی۔ روشن اور متحرک ——— ایک چھوٹی سی خوبصورت ندی اپنے رنگین پانیوں سے چٹان پھلانگ کر آرہی تھی۔ اور آگے ہی آگے بڑھتی ہوئی ایک دلنشین انداز میں مڑ کر ایک کالے پہاڑ کے عقب میں غائب ہو گئی تھی۔ اور یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ وہ کہاں تک چلی گئی تھی۔ مگر دیکھتے دیکھتے اس کا پاٹ اتنا چوڑا ہو گیا کہ وہ ایک بڑے تالاب یا جھیل کی صورت اختیار کر لی۔ جس کا پانی ہر لمحہ پہاڑ کو اپنے حلقے میں لئے پھیلتا اور بڑھتا جارہا تھا۔ نیز اس کی چوٹی پر ایک دیوزاد سایہ نمودار ہو گیا تھا۔ جو اپنے سیاہ پیرے سے اس خوش نما ماحول کو ماتمی بنا رہا تھا۔ مگر تالاب بھی گویا تہیہ کر چکا تھا کہ وہ سمندر بن کر ہی چین لے گا۔ رنگین پانیوں والا سمندر۔ پھر جس میں اس پہاڑ کی چوٹی تک غرق ہو جائے گی۔ ساری سیاہیاں اس امنڈتے ہوئے نور کے سیلاب میں ڈوب جائیں گی۔

قمر نے کتاب بند کر دی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ وہاں سے چل پڑے۔ اسٹیشن روڈ پیر روہم کے قریب کامریڈ نثار اشرف سے ملاقات ہوئی۔ وہ قمر کے دوست ہیں۔ ان

دونوں میں گھل مل کر باتیں ہونے لگیں۔ اور سلامت سوچنے لگا کہ لوگ کمیونسٹوں سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ اب ایسی بات کو لیجئے۔ نثار اشرف قمر سے پارٹی چندہ زبردستی وصول کرتے ہیں۔ اپنے ادارے کی ہر نئی کتاب خریدنے پر مجبور کرتے ہیں اور وہ باوجود اپنی تنگ دستیوں کے برداشت کرتا چلا جاتا ہے۔ مزید یہ کہ الٹا وہ ان کی ہمدردیوں، محبتوں، قربانیوں کی تعریف کرتے نہیں تھکتا۔ لیکن ان کی برائی کرنے والوں کی بھی کمی نہیں جن میں سے ان کا آفیسر بھی ایک ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کمیونسٹ راکھشش ہوتے ہیں۔ اور ثبوت دیتا ہے کہ وہ لاٹھیوں اور گولیوں سے بھی نہیں ڈرتے۔ ظاہر ہے کتنی احمقانہ ہے ان کی منطق۔

"آپ کی تعریف" قمر نے سلامت اور نثار اشرف کا ایک دوسرے سے تعارف کرایا۔

"کہیے صاحب تازہ خبر کیا ہے"۔ اب وہ براہِ راست اسی سے مخاطب ہوئے

اس نے کہا۔ "جی! میں نے آج اخبار نہیں دیکھا ہے۔ آپ ہی بتلائیے"

"میں بتاؤں؟ —— انہوں نے کچھ حیرت کا اظہار کیا۔ اور مسکرانے لگے۔ اور پھر جیسے ان کی پُر اعتماد مسکراہٹ سرگوشیاں کرنے لگی کہ مجھے تم سے یہی امید تھی "مگر میری بات کا آپ کو یقین بھی آئے"

"معاف فرمائیے۔ آپ کی یہ بات میں سمجھ نہیں سکا"

"بات اصل میں یہ ہے —— کہ کمیونسٹوں کو سرمایہ داروں کے پریس نے بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا ہے کہ وہ ملک کے دشمن ہیں۔ وہ ہر کام روس یا چین کی ہدایت پا کر کرتے ہیں مجھے اندیشہ تھا۔ کیا معلوم آپ بھی ان کے دھوکے میں نہ آگئے ہوں —— خیر مجھے معاف فرمائیے۔ لیکن آئیے اس پر آپ بھی غور کیجیے کہ شام کے نہتے عوام پر سامراجیوں کی مدد حاصل کر کے اسرائیل کی بمباری کو کیا ہم حق بجانب قرار دے

سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ اس ذکر کو چھوڑیے۔ آج کی نکسن کی پریس کانفرنس ہی کا جائزہ لیجیے''۔ نثار اشرف کے تیکھے خدوخال ابھر کر چھری چاقوؤں کی مانند نظر آرہے تھے جو سچ کو جھوٹ اندھیرے کو اجالے سے الگ کر رہے تھے۔ پریس کانفرنس کا جائزہ لینے کی نوبت ہی نہ آئی۔ کیونکہ ہم جیسے ہی مرسٹڑ چوک کے قریب پہنچے۔ ایک چیتھڑوں میں لپٹا ہوا بھکاری ہم پر جھپٹ پڑا۔ ''اللہ رسول کے نام پر ۔ محبوب کے نام پہ ۔ بابا ایک پیسہ۔ کل سے بھوکا ہوں''۔ اور سلامت کو غصہ آیا۔ یہ فقیر آخر ایک پیسے میں بھوکا پیٹ کیونکر بھر سکتا ہے۔ جبکہ قحط کی وجہ سے ملک میں اناج کا بھاؤ آسمان سے باتیں کر رہا ہے ''او بڈھے میاں ادھر آؤ۔'' سلامت نے بھکاری کو قریب بلایا۔ تم جانتے نہیں۔ یہ زمانہ ان لوگوں کا نہیں''۔

''کون سے لوگ سجی مائی باپ''

''دیکھو اب تم اپنے ملک کے ان وزیروں کے نام پر بھیک مانگنا۔ مسز اندرا گاندھی۔ مسٹر جگ جیون رام۔ مسٹر فخر الدین علی احمد۔ کیا سمجھے''۔ بڈھا بوکھلایا ہوا آگے بڑھ گیا۔ کامریڈ ہنسنے لگے۔ سلامت کے جی میں آیا۔ ان کے ہونٹوں پر ہتھیلی رکھ کر اس مسکراہٹ کو منجمد کر دیں۔ تاکہ اس سے نکلتی ہوئی اعتماد کی کرنیں بند ہو جائیں۔ کامریڈ سے رخصت ہو کر وہ مشکل سے کوئی پچاس قدم چلے ہوں گے کہ سامنے کہیں نعروں کی آواز بلند ہوئی۔ ان کا خیال سنگھیوں کی طرف گیا۔ کیونکہ ان کی سرگرمیاں جلسے جلوس کی صورت میں زوروں پر تھیں۔ مگر جیسے جیسے وہ بڑھتے گئے نعرے صاف سنائی دینے لگے۔

''پنڈت جواہر لال نہرو کی جے''۔ ''راجندر پرساد کی جے''۔ ''ابوالکلام آزاد کی جے''۔

''اوہو۔ یہ تو اپنے ملک کو آزاد کرانے والوں کی جے کار ہے''۔

"مگر آج کس سلسلے میں۔ کوئی وزیر تو نہیں آیا"۔ قمر اور سلامت یہی باتیں کر رہے تھے کہ بھنڈیوار بیس کی جانب سے درگد بیل میں دس بیس نوجوان ایک بگڑی ہوئی موٹر کو دھکیل دھکیل کر لڑھکاتے ہوئے آرہے تھے۔ ڈرائیور بیٹھا ہے۔

"پنڈت نہرو کی" موٹر دھکیلنے والوں کا جوش بڑھتا ہے۔ اور فضا گونج اٹھی ہے۔ "جے"۔

"راجندر پرساد کی"

"جے"۔

"ابو الکلام آزاد کی"

"جے"۔

بھئی واہ۔ قمر اور سلامت ہنسنے لگے۔ چوک میں کھڑا ٹریفک پولس ہنس رہا تھا۔ دوکاندار اپنی بیٹھکوں سے جھک جھک کر دیکھتے ہوئے ہنس رہے تھے۔ "تم چلو میں دیکھ آتا ہوں۔ یہ لوگ کمیونسٹوں کے بہکاوے میں تو نہیں آئے"۔ قمر بھی چلا گیا۔ اکیلا سلامت یہ سوچتا ہوا گھر کا راستہ لیا کہ یہ کمیونسٹ ومیونسٹ کچھ نہیں۔ طوفان کی آمد آمد ہے نعرے، ہڑتالیں، لاٹھی چارج، گولی باری، پھانسیاں چیخ چیخ کر کہہ رہے ہیں۔ روزِ حساب قریب ہے۔ روز حساب قریب ہے۔

مجھے دیکھتے ہی صحن میں کھیلتے ہوئے بچے چلائے۔ "ابا آئے ابا آئے"۔ اور سلامت گھر میں داخل ہو کر ٹوپی ٹانگ رہا تھا۔ تین سالہ جنو اسکی ازار کا سہارا لئے ایڑیاں اٹھا اٹھا کر اس کے جیبوں کی تلاشی لینے لگی۔ اور جب وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ تو بسورنے لگی۔ "ابا بی سٹ" پھر اسے خاموش پا کر خود ہی بڑبڑائی۔ "ابا بی سٹ نہیں لائے"۔ کونے میں کھڑا ہوا منیر وہیں سے روہانسی ہوا۔ "ابا کتاب لائے"۔ وہ

پھر بھی خاموش رہا۔ "صبح جناب ہمیں کلاس سے باہر کر دیں گے۔" تو وہ کیا کرے۔ تنخواہ جو نہیں ملی۔ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگا۔ اکاؤنٹنٹ کہتا ہے کہ میونسپل میں روپیہ نہیں ہے۔ اور سرکار سے قرض مانگا گیا ہے۔ مگر پھر اسے خیال آیا۔ میونسپل تو سرکار سے قرض مانگتی ہے۔ اور سرکار ورلڈ بینک سے۔ پھر تنخواہ کب ملے اور اس نے رجو کو ہٹا دیا اور منیر کو جھڑک دیا۔

پہنچی وہیں پہ خاک ......

اسکی حالت بالکل اس مجاور کی طرح تھی جس کے سامنے کرکری راکھ کی صحنک رکھی ہوئی ہو۔ جسے چھوتے ہی جسم میں جھرجھری دوڑ جائے۔ اور ناک کی خشکی دور کرنے کے لئے بٹے ہوئے دھاگے کو نتھنوں میں چڑھا کر چھینکنا پڑے۔ یا عود دان سے اٹھتے ہوئے عود کے گرم گرم بھپکارے حلق میں گھس کر فاتحہ خوانی کی روانی کو روک دے۔ مگر چراغی اور نذرانے کی لالچ میں وہ اس روکھی روکھی فضا میں معجزوں اور کرامتوں کا نور بکھیرتا رہے۔

وہ پورے دس مہینوں تک پرائمری اسکول میں ٹیچری کے بعد علیحدہ کیا جا چکا تھا۔ اس کی ملازمت عارضی تھی۔ جو ٹریننگ کے لئے جانے والے ماسٹروں کی خالی جگہ پر

بھرتی کی گئی تھی۔ اور اب پھر اس کے لئے بیروزگاری کی ذلتیں تھیں۔ چونکہ اس سے محنت مزدوری نہیں ہو سکتی تھی۔ جسم میں اتنا روغن نہیں تھا کہ اٹھتے بیٹھتے جوڑوں سے چٹ پٹ کی آواز نہ آئے۔ بوجھ اٹھانے پر آنکھوں میں تتلیاں اڑتی ہوئی معلوم نہ ہوں اور سر میں کنگھی کرتے وقت بالوں کے گچھوں کے گچھے نہ اکھڑ آئیں۔ دراصل مسلسل پندرہ سولہ سال تک اسکول، ہائی سکول اور کالج کی راتیں چراغ کے سہارے بسر کرنے کے بعد ساری طاقت، ساری روشنی، سارا روغن جیسے ختم ہو چکا تھا۔ وہ موٹی موٹی کتابیں پی گئی تھیں۔ جن کے طفیل وہ آج گرایجویٹ کہلاتا تھا۔ اور اس ٹیچری کی آسامی کو حاصل کرنے کا اہل سمجھا گیا تھا۔

پھر وہ ایک جرأت کر بیٹھا۔ "پہلے دعا کرو تاکہ یہ سب نوکر مر جائیں۔ پھر تم امیدواروں کے لئے جگہ بن سکے گی"۔ میونسپل پریسیڈنٹ نے ایٹم بم کا نسخہ بتایا۔ "بھائی سوچو ذرا۔ ہم کتنوں کو نوکریاں فراہم کریں۔ تم تعلیم یافتہ ہو۔ تجارت کرو گے تو کامیاب ہو جاؤ گے" یہ ہمدردانہ مشورہ گویا آئندہ الیکشن کی تیاری تھی۔ اور وہ لوٹ آیا۔ ان لوگوں کی زندگیوں کے بارے میں سوچتے جو کامیاب ہیں۔ جو بلیک مارکیٹ کرتے ہیں، رشوت کھاتے ہیں، مزدوروں کا خون چوستے ہیں، کسانوں کو بھوکا مارتے ہیں اور تمام دولت کو بینکوں یا اور کہیں بند کرکے ہاتھی کے کان برابر تالا ڈال دیتے ہیں۔ اور کہتے پھرتے ہیں۔ ہر کسی کو آزادی ہے۔ کمائے۔ کھائے یا۔ مر جائے۔

زندگی کو کامیاب بنانے کا یہ تصور کتنا غیر شریفانہ ہے کہ جب تک دوسروں کو تباہ و برباد نہیں کیا جا سکتا کامیابی کا تاج اس کے سر پر سج نہیں سکتا۔ اور اسے بھی محض "اتفاق" کی غیر معین اور جاہلانہ تاریکی میں گھسٹ گھسٹ کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے کہنیاں اور ٹخنے لہولہان ہو جائیں اور زخم میں زہریلا مواد پیدا ہو کر

ناسور بن جائے ۔ اور وہ درد کو برداشت نہ کر کے دم توڑ دے۔ تعجب کی بات نہیں۔
یونہی سب لوگ مر جاتے ہیں ۔

پھر اس کی بیوی نے اس کے اندھیارے دل میں امید کا ایک جگنو رکھ دیا.
تاکہ اس کی ننھی سی کرن سے اس کی دنیا میں اجالا ہو جائے ۔ اور وہ اس کے محبت بھرے
دل کی ملتجیانہ خواہش کو رد نہ کر سکا ۔ اور اس کے ساتھ اپنی سسرال چلا آیا تھا۔ یہاں
پر اسے غمگین رہنے کی کوئی وجہ نظر نہ آتی تھی ۔ جڑیں پھیلایا ہوا آرام تھا۔ پھر بھی وہ
خوش نہ تھا ۔ آٹھ مہینوں کے اس قیام میں اس نے گاؤں کے جنوب میں پہاڑوں کے
اندر غاروں میں بنائے ہوئے منگلیشور کے وشنو مندر کے کئی چکر کاٹے ۔ ان غاروں کے
مندروں کے حسن اور تقدس میں تیرہ سو سال بعد بھی کوئی فرق نہ آیا تھا ۔ ہر بار اس عظیم معمار
کے بلند عزائم کا معترف ہونا پڑتا کہ اس نے کیسے ان پہاڑوں کے سینوں کو چاک کر کے پتھروں
کو گویائی بخشی تھی ۔ مگر ان پہاڑوں کے اطراف حد نظر تک پھیلی ہوئی ویران اور بنجر کاشت
زمین نہ جانے کس منگلیشور کے انتظار میں بجھی ہوئی تھی ۔ ہزاروں سال سے خار دار جھاڑیاں
اور کوڑا کرکٹ اس کے سینے سے رس چوستے جا رہے تھے ۔ جوار کی روٹیوں اور نمک پر گذارہ
کرنے والے ، کھر یا کدال اٹھائے ۔ مریل بیلوں کو ہنکاتے ۔ کھیتوں کو جانے والے ان گنوار
کسانوں ، بیلوں بھینسوں کے گوبر سے اُپلے تھاپتی بدنصیب عورتوں اور گالیوں بھرے دوں کو کانٹے
پتھر چنواتے ننگ دھڑنگ بچوں میں تو کوئی ایسا منگلیشور نہ ہو سکتا تھا جو اس دھرتی ماں کے
سینے سے ابلنے والے دودھ کی توانائیوں پر اپنا حق جتا سکتا ۔

اور وہ اب ان لوگوں میں رہتے بستے تھک چکا تھا ۔ ان کے کبھی نہ بدلنے والے
شب و روز سے بیزار ہو چکا تھا ۔ نیز یہاں ان آٹھ مہینوں میں بھی اس کی روزی روٹی کا
بندوبست نہ ہو سکا تھا ۔ اس کے خسر بھی اس کے لئے ملازمت تلاش کرتے کرتے تھک گئے

تھے۔ اس سلسلے میں ان کی طرف سے اب پہلی سی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں ہو رہا تھا۔ لہٰذا پھر انہیں اپنے شہر واپس آنا پڑا۔

اور اب وہ دن بھر میونسپلٹی کے احاطے میں عرضی نویسوں کے ساتھ بیٹھا رہتا۔ دراصل عرضی نویسوں کے زمرے میں شامل ہونا بھی بڑا جوکھم کا کام تھا۔ وہ اپنی شطرنجی بچھاکر دوات، قلم، بلاٹنگ پیپر، تھمب پیڈ، کاغذ اپنے بھدّے دیودار کے صندوق سے نکال کر "ہر چیز آٹھ آنہ" والے کی طرح پورے چبوترے پر پھیلا لیتے تھے تاکہ اس کے بیٹھنے کے لئے ایک فٹ جگہ بھی نہ مل سکے۔ مگر جب وہ دیکھتا کہ وہ اپنے کام میں پوری طرح منہمک ہو گئے ہیں۔ تو چرمی بیگ فرش پر رکھ دیتا۔ اور چپکے سے اپنے بیٹھنے کے لئے ان کی چیزیں ہٹا کر جگہ بنا لیتا۔ لکھنے سے فراغت پا کر وہ اسے یوں شب خون مارے دیکھتے تو اس سے تو کچھ نہیں کہتے۔ البتہ آپس میں جی متلانے والے مذاق شروع کر دیتے۔ درحقیقت وہ اپنے گاہکوں کی جیبیں کاٹنے کے لئے بھی ایسی ہی کمینگی برتتے تھے۔ جھوٹے، فریب، جھگڑے کھڑے کرنے کی ترکیبیں۔ دشمن کو اشتعال دلانے والے پلان، آفیسروں کو رشوتیں فراہم کرنے کی چالیں، سب کچھ ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ گویا اس گندگی اور گھناؤنے پن کے وہ عادی ہو چکے تھے۔ بڑے بڑے آفیسروں کے نام وہ کچھ اس بے پرواہی سے لے ڈالتے جیسے وہ ان کی پھٹی ہوئی شطرنجی ہیں۔ صبح دس بجے آئے بچھا کر بیٹھ گئے۔ شام ہوئی تہ کرکے صندوق میں رکھ دیا۔ نہ اسے جھٹکنے کی ضرورت۔ نہ دھونے کی فکر۔

باوجود ان ساری برائیوں کے وہ سمجھتا تھا۔ ابھی کوئی نیکی ان میں باقی ہے۔ اور وہ اسے اچک لینا چاہتا تھا۔ تاکہ اس کا کام بھی بن جائے۔ اور یہ لوگ اس سے ایسا سلوک نہ برتا کریں۔ وہ کوئی ان کی روزی پر ڈاکہ ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے زیادہ کام میں سے وہ کچھ اس کے لئے بھی بچا کر دیا کریں۔ چونکہ شہر کے تقریباً تمام لوگ ان پرانے

چبوترہ نشین عرضی نویسوں میں بٹ چکے تھے۔ ان کے واقف کار تھے۔ اس لئے ہر کوئی انہی کی طرف رجوع کرتا اور وہ شام تک سگریٹ جلاتے، کتابیں پڑھتے، کچہریوں میں گھومتے خالی ہاتھ گھر چلا آتا۔ بیوی تاڑ جاتی اور اپنے آپ کو مسرور ظاہر کرنے کی ایسی کوشش کرتی۔ جیسے وہ اس کا رہن پڑا ہوا جہیز چھڑا کر ہی تو لایا ہے۔ دراصل وہ اس کے حوصلوں کو بلند رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔ اسے ان نحوست زدہ دنوں میں بھی ہمیشہ خوش رکھنے کی کوشش میں مصروف نظر آتی۔ کبھی کسی بات پر اس کی جانب سے غم و غصہ کا اظہار نہ ہوتا۔ اس کے چہرے پر حسرت و یاس کی ایک دھندلی سی لکیر تک نہ دکھائی دیتی۔ حالانکہ وہ ایک خوشحال گھرانے کی بیٹی تھی۔ مگر اس نے کبھی اپنے اس معیار کو بدستور جاری رکھنے کا مطالبہ نہ کیا۔ اور یہی بات کبھی کبھی اسے تڑپاتی تھی۔

اور جب وہ اپنے متعلق سوچنے لگتا تو وہ سارے دکھ (دکھ کی بات یہ ہے) جو اسے ایک خوشحال متاہل زندگی کی تمنا رکھنے پر اٹھانے پڑ رہے تھے۔ اس کے لئے کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ ہوش سنبھالا تھا یتیم خانے میں اور یتیم خانے کی یتیمی گویا دنیا کی سب سے بڑی لعنت ہوتی ہے۔ بھیک مانگ کر پیٹ پالنا، بازاروں میں اپنی بے کسی و بے بسی کا رونا رو کر جھولیاں پھیلانا، چندوں، فنڈوں، اسکالرشپوں سے تعلیم حاصل کرنا۔ مگر یہ اس کا ہی حوصلہ تھا کہ وہ ان اخلاقی پستیوں سے کسی طرح ابھر آیا۔ اور بی۔اے میں نمایاں نمبرے کر کامیاب ہوا۔ اور یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا کہ اس کے خسر کو ایک وقتی جوش نے اپنی بیٹی کو اس کے پلے باندھ دینے پر مجبور کیا۔ اور اب ادھر کچھ دنوں سے اس کی بیوی کو محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کی رگوں میں خون کی روانی کبھی کبھی تیز تر ہو جاتی۔ اس کا دماغ نئے نئے خوابوں سے آشنا ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے جگر سے کوئی میٹھے میٹھے ٹھوکوں سے اٹھکیلیاں کر رہا ہے۔ تو وہ اچانک گم سم سی ہو گئی۔ نئے آنے والے مہمان کے متعلق بیوی کے اس ردِ عمل سے وہ بری

طرح بوکھلا گیا ۔ مگر پھر وہ سنبھل گئی اور جہاں اس خوشی سے اس نے اپنے تخیل کو خوب ہرا بھرا کر لیا تھا۔ وہاں اس کے افکار و آلام بھی بیوی کے پیٹ کی طرح دن بدن بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ اسے آنے والے اخراجات کے پیش نظر کچھ نہ کچھ کرنا ہی چاہیئے تھا۔ وہ سوچتا تھا اگر اس کے طور طریقوں میں تبدیلی نہ آئے گی اور وہ عرضی نویسوں کی برادری سے کٹا کٹا سا رہیگا۔ تو یہ بڑی حماقت ہو گی۔ اسے ان سے دوستانہ مراسم بڑھانے کا ایک بھی موقع ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ اور وہ اسی خیال سے زبردستی ان کی چائے، سگریٹ وغیرہ سے تواضع کرنے لگا۔ بات بے بات اپنی غربت کا رونا رو کر نہایت شاگرد پیشہ انداز میں کوئی پیشہ ورانہ صلاح پوچھتے ہوئے، خوش مزاج، باتونی اور کبھی ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا ہوا چاپلوس بننے سے بھی نہ ہچکچاتا۔ گویا کہ اس نے اپنی یتیم خانے کی تربیت کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ اور اس طرح انہیں چپکتے چپکتے رام کر ہی لیا۔ وہ جانتا تھا ناگوجی ریلوے کے ایک بہت بڑے آفسر کا پارٹنر بھی ہے اور ان عرضی نویسوں کا گرو بھی۔ ناگوجی سے خفیہ ملاقات کر کے اس نے طے بھی کر لیا تھا کہ ریلوے میں کوئی آسامی پر اس کا تقرر کرا دے۔ بس اخبار میں اشتہار نکلنے کی دیر تھی۔ ادھر ناگوجی کی نظر کرم سے روزانہ چار چھ روپیوں کی آمدنی بھی ہو رہی تھی۔ زندگی میں ایک ذرا رنگ و نور سا مل رہا تھا۔ کام کرنے کی صلاحیتیں بڑھ سی گئی تھیں۔ اور خانگی حالات میں ایک گوارہ پن پیدا ہو گیا تھا۔

پھر ایک شام جب وہ ناگوجی کے پیچھے پیچھے ریلوے آفسوں میں گھوم پھر کر گھر لوٹ رہا تھا ہریش سے ملاقات ہو گئی۔ ہریش ایک ایسی جماعت کا ممبر تھا جس پر آتش زنی، بے گناہوں کے خون اور لوٹ مار کا الزام تھا۔ جو قومی زندگی میں انتشار پھیلانے کی موجب بنی تھی۔ مگر یہ ضرور تھا کہ ہریش جب سے اس جماعت کا ممبر بن گیا تھا۔ اس کی زندگی میں ایک انقلاب سا آ گیا تھا۔ اس کے حالات سنور سے گئے تھے۔ منجملہ اور نعروں کے

اس جماعت کا ایک نعرہ یہ بھی تھا۔ "موجودہ حکومت ہر ایک کو روزی روٹی مہیا نہیں کر سکتی۔ یہ سرمایہ داروں کی پٹھو ہے۔" اور موجودہ حکومت کی انتظامی مشنری کی غلط کاریوں سے نوجوانوں میں یاسیت پھیل گئی تھی۔ اور وہ ان دلکش نعروں کے جال میں پھنس کر بد اصول جماعتوں میں شامل ہو رہے تھے۔ نفرت کو ہوا دینے والی جماعتوں کی طاقت بڑھا رہے تھے۔ اور شاید در پردہ چند ایک نوجوانوں کا اس سے ذاتی فائدہ بھی بندھا ہوا تھا نا آسودہ حالات کو بدلنے میں کیا خیر و شر کی حکمت عملی غیر مؤثر ثابت ہوتی ہے؟ ۔ وہ انہی خیالات میں گھرا ہوا گھر کے قریب آیا۔ تو اس کے گھر میں ملی جلی آوازوں کا ایک دھیما سا شور سنائی دیا۔ لیکن کر وہ گھر کے اندر چلا گیا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ بیوی کو پڑوسنیں جکڑی ہوئی تھیں اور وہ پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی جیسے اس کی بیوی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ "آ گیا تو ـــــ لے یہ تیری چڑیل کو سنبھال اب۔ بڑی چاؤ تھی تجھے ـــــ دودھ پلا اپنی چھاتیوں سے ...." برسوں کی ضبط کی ہوئی غلیظ نفرت کا بند جیسے ٹوٹ گیا تھا۔ اور بدبودار گالیوں کے تھپیڑے اس کا منہ پھیرے دے رہے تھے۔ اور دانت کٹکٹاتے ہوئے پوری طاقت سے جھٹکا دے کر اس کی طرف اس نے بڑھنا چاہا۔ اور دھیمے دھیمے کراہنے لگی۔ اس کے دانت آہستہ آہستہ آپس کی رگڑ سے "کرم کرم" کی آواز پیدا کر رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا کرے۔ اس کی تو دنیا لٹ گئی تھی اس ناگہانی آفت کو وہ کیسے جھیلے۔ اچانک نوزائیدہ بچی رونے لگی۔ مضطربانہ بڑھ کر وہ بچی کو اٹھا لیا۔ اور ہمت کر کے بیوی کے قریب لے گیا۔ بیوی کا چہرہ درد اور تکلیف کی وجہ سے سیاہ پڑ گیا تھا۔ اور از حد ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ اس کے خد و خال میں بلا کی سختی اور تناؤ آ گیا تھا۔ آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا تھا۔ "نہیں دیکھتی کیوں دیکھوں اس بد رخ کو ـــ" اور پانی کا لوٹا اٹھا کر غٹ غٹ پینے لگی۔ اس کے بدن سے خون اور

پسینے کی بو میں ملی جلی گرم گرم بھانپ اٹھ رہی تھی ۔ ضعف اور تھکن سے وہ آنکھیں موندے بڑبڑانے لگی ۔ زچگی کے اذیت ناک درد سے اس کا دماغ چل گیا تھا ۔ پھر خونی دوروں سے وہ ادھ موئی ہو گئی تھی ۔ بچی کو وہ اس کے پہلو میں لٹا کر ایمبولینس کے لئے فون کرنے مڑا ہی تھا کہ بچی رونے لگی ۔ اس کی بیوی آنکھیں پھاڑ کر بچی کو اپنے پہلو میں روتے ہوئے دیکھا ۔ تو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر بچّی کو چھاتی سے لپٹا لیا ۔ ٹروسنیں مطمئن ہو کر ذرا ہٹ گئیں ۔ اور غیر ارادی طور پر آپ اپنے بازوؤں کو سہلانے ہانسلنے لگیں ۔

فیصلہ

سڑک پر میونسپل کی بجلی بتی روشن رہنے کے باوجود آج لالٹین جل رہا تھا۔ فرش پر کھجور کے بوریئے بچھے تھے اور اس پر بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تھے جن میں اس محلے کے لوگوں کے علاوہ اجنبی بھی تھے۔ مگر سب خاموش! —— نہ آج موسم فصلیں اور کام دھندے کی باتیں ہو رہی تھیں، نہ ہی ہنسی مذاق اور نہ کوئی تفریحی کھیل خلافِ معمول آج عاشور خانے کی فضا کچھ بھاری بھرکم اور کچھ پراسرار سی تھی۔ مگر دیا سلائی کی خالی ڈبیاں، مونگ پھلی کے چھلکے اور جلی ہوئی بیڑیاں بھی بکھری پڑی تھیں۔

"ہر ایک کے آگے بیٹے بیٹیاں ہیں۔ آج اس کی انصاف ہو کر رہے۔" ملک نے بڑی ذمہ داری سے لوگوں کے جذبات سے اپیل کی۔

"جیسے کوئی پوچھنے والا ہی نہیں ہے اُسے۔ دیکھیں اس مائی کا فیصلہ ہوئے بغیر یہ شادی کیسے ہوتی ہے۔" تاڑی کی کھٹی باس فضا میں لڑکھڑاتی ہر ایک کی ناک سے ٹکرانے لگی۔ جمو نہایت جوش میں تھا۔

"کھیل سمجھا ہے کھیل"۔ گھوڑو اکڑوں سے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

اور گھوڑو کو داول نے کہنی مارا "وہ آئے"۔ اور لوگ آڑے ترچھے ہو کر گردنیں اونچی کر کے دیکھنے لگے۔ میونسپلٹی کی بجلی بتی کے اجالے میں نظر آیا۔ دو تین مرد آ رہے تھے اور ان کے پیچھے ایک عورت جس کی بغل میں ایک بچہ تھا۔ اور وہ چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ نو وارد اس عورت کو عاشور خانے کی پچھلی دیوار سے لگ کر بٹھا آئے۔ ذکر یہ تھا کہ اس عورت کا شوہر دوسری شادی کے لئے یہاں دولہا بن کر آیا ہوا تھا۔ مگر کیوں! وجہ بالکل سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ عام طور پر مردوں کے دوسری شادی کرنے کے تمام جوہات کی تردید ہو رہی تھی۔ عورت کے بغل میں بچہ تھا جس سے اس پر بانجھ ہونے کا گمان نہیں ہو سکتا تھا۔ علاوہ وہ اگر بدچلن ہوتی تو وہ شوہر پر اپنا حق جتا کر اس طرح پنچایت نہ کھڑی کر سکتی تھی۔ شاید بدصورت ہو۔ مگر دس پندرہ سال تک تو میاں کو اس کا ساتھ گوارہ رہا۔ اب کیسے ان کی رگِ لطافت بھڑکی؟ نہیں یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ کچھ اور ہے۔

مجلس پر پھر سکوت چھا گیا تھا۔ اور ان لوگوں کی یکسوئی اتنی پرعظمت تھی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عاشور خانے کے تمام اور بھی تن کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ دیواروں کے سینے اینٹھ کر اور آگے آ گئے ہیں اور وہ سب مل کر جھپٹ پڑنے کے لئے تیار ہیں۔ مگر ان کے اطراف تیرہ و تار کائنات پھیلی ہوئی تھی۔ جس کو روشن کرنے کے لئے ایک ہی چراغ تھا ان کے پاس اپنی طاقت کا۔ مذہب اور اخلاق کے چراغ، دولت کی تند ہواؤں کی زد میں

جیسے دم توڑ رہے تھے۔

محلّے کے سرپنچ راجے خان تشریف لائے۔ راجے خان نے لوگوں کو اپنے ساتھ شادی کے گھر چلنے کے لئے کہا۔ اور اس عورت کو اپنے گھر واپس کر دیا۔ مردوں میں عورتوں کا کیا کام۔ جبکہ اس عورت کے رشتہ دار یہاں موجود ہوں۔ ملک اور اس کے ساتھی راجے خان کو اس عورت کا فیصلہ کئے بغیر نکاح کی اجازت نہ دینے کی تاکید کرنے لگے۔ راجے خان کو غصّہ آیا کہ یہ کمینے لوگ منہ سے منہ بھڑا کر باتیں کرتے ہیں۔ موقع و محل، اونچ نیچ کچھ نہیں سمجھتے۔ اور اب غنڈوں کو ساتھ لے کر مذہبی کارروائیوں میں بھی دخل دینے لگے ہیں۔ کوئی ان سے کہتا اس زمانے میں کرتے یہ نخرے۔ راجے خان کو اپنے دبدبے اور طنطنے کا زمانہ یاد آیا۔ مجال تھی شرابیوں کی ذرا بلند آواز سے بات کریں۔ زمین پر گرا کر پچیس گھڑے پانی ڈلواتے تھے۔ وہ زمانہ بھی کیا تھا۔ مٹی کو چھوؤ تو سونا ہو جاتا تھا۔ یہی سیندھی، شراب، گانجا افیون کی ٹھیکیداری تھی۔ خدا کے فضل سے کسی چیز کی کمی نہ تھی اور ان کا ایمان تھا خدا جب دیتا ہے تو اس کی راہ میں لٹانے میں کیا حرج ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی کشادہ دلی اور خدا ترسی کا دور دور تک چرچا تھا۔ نیز سرکار دربار میں بھی آپ کی وہی عزت مانی جاتی تھی۔ محرم میں جب پولس کمشنر بہادر سوانگ بھرنے والوں کو انعام بانٹنے کے لئے تشریف لاتے تھے تو سب سے پہلے آپ ہی کو یاد فرماتے۔ مگر اب وہ دبدبہ وہ طنطنہ ماضی کی داستان بن گیا تھا۔ جائداد کے جھگڑوں میں ان کا سب کچھ تباہ ہو گیا تھا۔ اور اس تباہی کا سبب نو دولتیا جمیل تھا۔ جو ان کے بھائیوں کو اکسا کر ان کی عزت و دولت برباد کرنے کے درپے تھا۔

"السلام علیکم" راجے خان شادی کے گھر پہنچ گئے تھے۔

"وعلیکم السلام" ایک پرجوش نعرے کی طرح گونج اٹھا۔ "آئیے ـــــ ادھر آئیے ـــــ یہاں شطرنجی پر آجائیے نا" دولہا میاں نے بہ اصرار راجے خان کو اپنے

پاس بٹھالیا۔ دولہا میاں کے گلے میں مٹھی بھر موتیا زرد سیوتی کے پھولوں کا ہار تھا۔ سر پر سرخ ریشمی رومال جس کی کناری زری کی تھی۔ دائیں کلائی میں سونے کا کڑا[1] اور بائیں پر بیش قیمت واچ، بھران کا عطر ملا ہوا چہرہ، گیس بتی کے اجالے میں ان کی ہر چیز جھل جھل جھمک رہی تھی۔ مگر انہیں چٹائی پر پرانی شطرنجی بچھا کر بٹھایا گیا تھا اور دو تین گودڑیوں کو ایک سفید چادر میں لپیٹ کر ان کے لئے گاؤ تکیہ بنایا گیا تھا۔ دولہا میاں نازک سے پستہ قد کمزور انسان تھے اور ان کی عمر پچاس سے ایک دو برس اوپر ہی تھی۔ ان کی داڑھی کمال چابک دستی سے مونڈھی گئی تھی۔ مونچھوں کے سفید بالوں کو اس صفائی سے کاٹا گیا تھا کہ کہیں بڑھاپے کی غمازی کا شائبہ نہ رہ جائے۔ مگر اس کوشش میں بہت بال کٹ جانے پر مونچھیں "بربلی" ہو گئی تھیں ایسے جیسے کہ آتشک کے مریض کی مونچھوں کے بال جھڑنے کے بعد دکھائی دیتی ہیں۔

دو چار ادھیڑ عمر کے چھوڑ کر براتیوں میں سب کے سب نوجوان تھے۔ یہ لوگ کچھ گھبرائے ہوئے سے تھے۔ ٹکر ٹکر ایک دوسرے کا منہ تکتے۔ کبھی کبھی سوکھی کھانسی کھانسنے لگتے۔ آلتی پالتی سے اکڑوں بیٹھ جاتے۔ ذرا سی آہٹ پر چونک کر آنکھیں پھاڑے ادھر ادھر دیکھنے لگتے۔ جیسے انہیں کوئی چوری کرتے پکڑ لیا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عاشور خانے کی ہنگامہ خیز مجلس ہی ان کے اضطراب کا سبب بنی ہوئی ہے۔ راجے خان نے الفاظ کو چبا چبا کر نہایت احتیاط سے معاملہ پنچ کے حلق میں اتارا۔ مگر ان کی ساری محنت اکارت گئی۔ براتی شاید اسی بات کے منتظر تھے۔ ایک نوجوان نے پوچھا۔ "اس وقت انصاف و نصاف کی کیا ضرورت تھی؟" دوسرے نے شور مچایا۔ "یہی وقت ہے انصاف کے لئے۔ آپ لوگ مجلسِ نکاح میں جھگڑے چکانے بیٹھے ہیں؟" بہت سے براتی اٹھ کھڑے ہوئے۔

---

[1]۔ بربلی = چھدری

"یہ ہماری بے عزتی ہے۔ اٹھئے بھائی جان، یہ بے عزتی برداشت نہیں کی جا سکتی۔" دولہا میاں اس پر بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ وہ پریشان تھے۔ یہ لوگ کیوں جلد بازی سے کام لے رہے ہیں۔ بیٹھ کیوں نہیں جاتے۔ دولہا میاں کو پہلے ہی معلوم تھا کہ یہاں گھمسان کا رن پڑیگا۔ اور وہ مدافعت کی تمام چالیں سوچ کر آئے تھے۔ مگر یہ نوجوان بھی سمجھ کے نوجوان ناحق شور مچا رہے تھے۔ "بیٹھ جاؤ بھائیو بیٹھ جاؤ۔" دولہا میاں اپنے براتی "نوجوان دوستوں" سے کہنے لگے۔ "کیا بیٹھیں۔ آپ نہیں دیکھتے یہ لوگ ہماری بے عزتی کر رہے ہیں۔" وہ طرہ نیچے رکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ان لوگوں کے کندھوں کو تھپک کر بٹھانے لگے۔ "اسی لئے کہہ رہا ہوں آپ لوگ بیٹھ جائیں" مجمع جب دھیما پڑا تو دولہا میاں کہنے لگے۔ "ہم لوگ اوکھلی میں سر دے چکے ہیں۔ ڈر کاہے کا۔ یہاں سے ہم جیت کر ہی جائیں گے۔ ان لوگوں کے کہنے سے خفا ہو کر لوٹنا ہماری ہار ہوگی۔" آہستہ آہستہ بڑبڑاتے ہوئے لوگ بیٹھ گئے۔ لیکن ان کے تیور بتا رہے تھے کہ دولہا میاں کو بھی وہ بیکار آدمی سمجھ رہے ہیں۔ چلن ہے کہ دولہا، دلہن کے مکان میں تخت پر بیٹھ جانے کے بعد جیسی بھی سخت ضرورت پیش آئے نکاح ہونے تک اٹھ نہیں سکتا۔ بات تک نہیں کر سکتا۔ مبادا کہیں جانبین میں جھگڑا پڑ جائے تو چوں کہے بغیر براتیوں کے ساتھ اٹھ کر چل دیتا ہے۔ اس سے نسبت ٹوٹ جائے، سینکڑوں ہزاروں کا نقصان ہو جائے، آستینیں چڑھ جائیں۔ دولہا میاں ایک طرف ہٹ کر دانتوں سے ناخن تراشتے کھڑا ہو جاتا ہے۔

"ہاں صاحب ___ پہلے مجھے آپ لوگوں سے معذرت چاہنی ہے۔ یہ جھگڑا اس وقت پیش کرنے کی ضرورت ہی ایسی تھی کہ ___" راجے خان سوچنے لگے۔ کیا ضرورت تھی۔ مگر جلدی میں کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکے۔ "آپ لوگ سمجھ گئے ہوں گے۔"

"ہاں صاحب سمجھ گئے۔" ایک ناسمجھ چلایا۔ پھر دلہن کی ماں کو بلایا گیا کیونکہ اس کا باپ مرچکا تھا۔ اور شاید رشتہ داروں میں بھی کوئی مرد نہ تھا۔ دلہن کی ماں سے پوچھا گیا۔ "دولہا میاں کی پہلی بیوی کے متعلق کچھ معلوم ہے۔" پردے کے پیچھے سے جواب ملا۔

"ہاں۔ اور اس نکاح سے پہلے اپنی پہلی بیوی سے علیحدگی کی شرط رکھ دی گئی تھی۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو۔" دولہا میاں کے کوئی بزرگ آپے سے باہر ہو گئے۔ مجمع میں پھر حرکت ہوئی۔ پردے کے پیچھے کھسر پھسر ہوئی۔ پردہ کانپا۔ اور دلہن کی ماں سے صاف جواب ملا کہ پہلی بیوی کا جھگڑا ختم کرنا ضروری ہے۔

"مگر میں اس کو بھی اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔" دولہا میاں نے لفظ لفظ پر زور دیا۔

"اس طرح صفائی نہیں ہوتی۔" بڑے خان سمجھائے۔

"تو مجھے اپنی بیوی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے آپ سے ہدایات لینے پڑیں گے۔ خیر۔۔۔ آپ ہی راستہ صاف کر دیجئے۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑے خان کا پکا خیال تھا کہ عورتوں کو بد سے بدتر حالات میں بھی طلاق نہیں لینی چاہیئے۔ اتفاق سے کہیں آپ نے کسی عورت کے طلاق کے متعلق سن لیا تو ایکدم بھڑک اٹھتے۔ عورت کا طلاق مانگنا بہت بڑی بے غیرتی کی بات ہے۔ رفتہ رفتہ اس عورت کو بھکاریوں کی سی ایک عادت پڑ جائیگی۔ جن میں چار گھر مانگ کر کھائے بغیر پیٹ نہیں بھرتا۔ مگر اس وقت ان لفنگوں سے کسی طرح آپ کو اپنی جان چھڑانی بھی تو تھی۔ اور وہ دولہا میاں کو گھیر گھار کر اپنی پہلی بیوی سے

علیحدگی حاصل کرنے کے متعلق خیالات معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر دولہا میاں نے صاف صاف اعلان کر دیا۔ وہ طلاق نہیں دیں گے۔ قاضی صاحب بڑی دیر سے راجے خان کی کوششوں کو ہمدردانہ نظر سے دیکھ رہے تھے۔ اور وہ دونوں ہمیشہ ایسے جھگڑوں میں ایک دوسرے کی مدد کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے۔ جیسے ان دونوں کے درمیان ایک درپردہ معاہدہ سا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی مدافعت بلا کسی سوچ بچار کے بڑھ چڑھ کر کرتے۔ مگر دولہا میاں نے جس بے مروتی سے راجے خان کو جواب دیا۔ وہ بے بسی کے عالم میں قاضی صاحب کا منہ تکنے لگے۔ تو قاضی صاحب نے مضطربانہ بڑھ کر دولہا میاں پر وار کر دیا۔

"میاں یہ مت سمجھو طلاق دینے کا حق صرف مردوں ہی کو ملا ہے۔ عورتیں چاہیں تو اپنے مردوں سے طلاق حاصل کر سکتی ہیں۔" دولہا میاں بھی ایک گھاگ تھے۔ قاضی صاحب کی دھمکی کا ان پر اثر نہ ہوا۔

"حضرت! میں نے یہ کب کہا۔ وہ مجھ سے طلاق حاصل نہیں کر سکتی۔ میں نے صرف اپنے ارادے کا اظہار کیا ہے۔" — قاضی صاحب لاچار ہو گئے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے۔ بیوی کا طلاق مانگنا یا خلع حاصل کرنا کتنا مہنگا سودا ہے۔ راجے خان ان باریکیوں سے بھنا گئے۔ آپ چاہتے تھے کوئی ایسی معقول تجویز ڈھونڈ نکالی جائے۔ جس پر دونوں فریق راضی ہو جائیں۔ پہلی بیوی کے رشتہ دار چاہتے تھے یہ شادی نہ ہو۔ اور دولہا میاں اپنی چالاکیوں سے خواہ مخواہ پیچیدگیاں پیدا کر رہے تھے تاکہ تمام لوگ مجبور ہو کر ان کی بات مان جائیں۔ اور شادی رکنے نہ پائے۔ راجے خان کی صلح جوئی کی لاکھ مساعی کے بعد بھی ہنوز روز اول کا معاملہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے نکاح ہونے کے انتظار میں مصری، بادام، چھوہارے کے خواب دیکھتے وہیں لڑھک گئے تھے۔ بوڑھے گھٹنوں میں سر دئیے اونگھ رہے

تھے۔ نوجوان اس بیزار کن ماحول سے بہانہ کر کے کھسک گئے تھے ۔ نیند، تھکاوٹ، بیزاری کے آثار سبھوں پر طاری تھے۔ صرف ملک اور اس کے ساتھی چوکنّا تھے۔ اور انہوں نے راجے خان کے اضطراب کو بھانپ لیا۔ اور آپ کو باہر لے گئے۔ واپس آ کر راجے خان نے فریقین کو فیصلہ سنا دیا۔

"غیر مشروط طور پر طلاق دینا ہوگا۔ شوہر شادی کے مصارف نہ طلب کرے اور بیوی مہر اور دوسرے اخراجات معاف کرے۔ فیصلہ کی عدم منظوری کی صورت میں اس نکاح کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔"

نپا تلا وار تھا۔ ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ فیصلہ کی عدم منظوری کی قیمت کیا تھی دولہا میاں کا دل ہی جانتا تھا۔ دولہن کی انہیں پرواہ نہ تھی۔ مگر دولہن کے جسم پر ان کے سونے کے زیورات تھے۔ اور دولہن کی ماں ان کے پچاس روپیوں کی مقروض تھی۔ اور یہ شادی بھی انہی پچاس روپیوں کے وصولنے کا ایک طریقہ تھا۔ ستم یہ کہ دولہن نابالغ تھی۔ اور ڈر تھا کوئی بدخواہ قانون کا پایہ نہ ہلا بیٹھے۔ اور ان کے پچاس روپیہ وصولنے کا ہیر پھیر کچھ کا کچھ نہ کر دے۔ پھر بھی انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا یا دولہن والوں کی دھوکہ بازی پر گرجے۔ ایک نافرمان عورت کو سزا دینے پر قاضی صاحب کو اکسایا۔ مگر کچھ بن نہ پڑا۔ اور وہ غصّہ کی شدت میں دولہن کی ماں پر ٹوٹ پڑے کہ بدبخت کو ان کی پہلی بیوی سے کیا خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ جبکہ اس کے گھر میں ان کا شادی کرنا اس پر احسان تھا کہ اس طرح بیچاری ایک پیٹ کے خرچ سے سبکدوش ہو جاتی۔ پچاس روپیہ تو پہلے ہی ہضم ہو چکے تھے شادی کے بعد اس کا کون تقاضہ کرتا۔ انہوں نے گن گن کر اپنے احسانات کو دہرایا۔ دولہن کی ماں اب تک خاموشی کے ساتھ ہر ظلم کو برداشت کرتی آ رہی تھی۔ کیونکہ دولہا میاں کے پچاس روپیہ ان کے ذہن، ضمیر، غیرت کو اپنی گرفت میں لے چکے تھے۔ اگر اس کے پاس گھر،

زیور، کھیت، نقدی یا کوئی کماؤ بیٹا ہی ہوتا تو یہ ذلت برداشت نہ کرنی۔ اس کی معصوم بیٹی کو اس بوڑھے کے پلے باندھنے کا کوئی ذکر بھی کرتا تو وہ اس کا منہ نوچ ڈالتی مگر اس کے پاس یہ سب کچھ نہیں تھا۔ سوائے اس معصوم جان کے جو اب دولہن بنی ہوئی تھی۔ اگر یہ بچی دولہا میاں کی نظروں میں نہ سماتی تو پتہ نہیں ان کی ترازو میں پچاس روپیوں کے وزن پر خود اسے تُلنا گوارہ کرنا پڑتا ۔ یا اور کوئی بے عزتی اٹھانی پڑتی ۔ مگر اُسے اپنی بیٹی کی نسبت طے کرنے کے بعد اس کے بھیانک مستقبل کے متعلق ایک کربناک سوچ پیدا ہوئی تھی کہ جب تک اس کی بیٹی شادی کا مقصد سمجھنے لگے ۔ دولہا میاں موت کا نوالہ ہو جائیں گے ۔ اس کی بیٹی دولہا میاں کے رشتہ داروں کے جھوٹے برتن مانجھتے ناخونوں کو گھسائیگی ، ہاتھوں کی دولت، رزق، اولاد اور سہاگ کی ریکھاؤں میں کالک اور کیچڑ بھرے گی ۔ یا اگر گھر سے نکال دی گئی تو باؤلی کنویں کی نذر ہو جائیگی ۔ یا بکاؤ مال بن جائے گی ــــ پنچایت کے بیچ دولہا میاں کی گالیاں سن کر ایک لمحے میں یہ تمام المناکیاں اس کی نظروں کے سامنے آگئیں اور اس کے سینے میں ہلچل سی مچ گئی ۔ برداشت کی بھی حد ہوتی ہے ۔ وہ بھاگ کر دولہن کے جسم پر کے تمام زیورات نوچکر پرده اٹھائی اور دولہا میاں پر دے ماری۔

"میں اپنی معصوم بیٹی کو اس گھاگ کے پلے باندھنے پر تیار نہیں ہوں۔"

ایک ہنگامہ مچ گیا۔ دولہا میاں کی گالیوں میں اور اضافہ ہو گیا۔ مگر جواب میں بھی کافی کوسنے سنائے گئے ۔ دولہا میاں زیورات کو اپنے کوٹ کی جیب میں ٹھونس کر ازالۂ حیثیت عرفی اور دھوکا دہی کا مقدمہ چلانے کی دھمکی دیتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے اور ملک اور اس کے ساتھی تالیاں بجا کر قہقہے لگانے لگے ۔ اور بڑے خان اور قاضی صاحب کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ دونوں ہنسیں یا روئیں ۔ لوگ اٹھ اٹھ کر باہر جانے لگے ۔ ملک اور اس کے ساتھ دولہن کی ماں کی طرف بڑھے ۔ "ماں! محلّے کی لاج رکھ لی تم نے ۔ تم بے فکر رہو، باقی

ہم نپٹ لیں گے۔" اور وہ بھی تیزی سے چلے گئے۔ سارا گھر خالی ہو گیا۔ اور اس شادی کے بھرے پُرے گھر کو اکیلا اور سنسان دیکھ کر دولہن کی ماں کی آنکھیں چھلک گئیں۔ مگر پھر ویسے ہی اس کی نظر گیس بتی پہ پڑی۔ جو چھت کی شہتیر سے لٹک رہی تھی۔ جس کی "پھرررر" سی آواز سے سارا مکان گونج رہا تھا اور اس کی بے داغ روشنی تاریک سایوں کو بھگا کر کونے کونے کو منوّر کر رہی تھی اور وہ آنکھیں پونچھ کر بچّی کی طرف پلٹ پڑی۔۔ اور اسے اپنی گود میں بھر کر پیار کرنے لگی۔" میری بچّی تو اب بھی دولہن لگ رہی ہے۔ سونے کے زیورات کے بغیر بھی"۔ اس کی خوابناک آنکھیں مسرور و مطمئن مامتا سے چھلکی جا رہی تھیں۔

ہاتھ خالی

ایک ہی کمرے میں پہاڑ ایسا دن ہم دونوں قلم چلاتے گذار دیتے تھے۔ وہ ڈسپاچ کلرک تھا۔ اور میرے ذمہ جنم مرن کا کھاتہ تھا۔ سلیم آفس کبھی دن بھی ٹھیک وقت پر نہیں آتا تھا۔ گھر اور آفس کے درمیان دو تین میل کا فاصلہ طے کرنا اس کی طاقت سے باہر تھا۔ اگر بس کے لئے پیسے نہ ہوں تو وہ ریلوے اسٹیشن یا بس اسٹانڈ جاتے ہوئے کسی جان پہچان کے یکہ گاڑی یا بیل گاڑی والے کا وسیلہ ڈھونڈتا۔ اور اگر کسی دن یہ بھی حاصل نہ ہو تو چھتری کا ہاتھا زمین پر ٹیکتے پیدل ہی چلا آتا۔ مگر اس طرح اسے دو تین اسٹاپ ضرور کرنے پڑتے۔ اور دیر سے آفس آنے کی خفت مٹانے کے لئے کھسیانے انداز میں اپنی ناطاقتی کا رونا رونے لگتا۔ وہ کسی اچھے ڈاکٹر سے علاج کرانے کے مشورے کو

نہایت معقولیت سے قبول بھی کر لیتا تھا۔ لیکن چار آنے کے علاج سے چٹکی بجاتے میں مردے کو زندہ کرنے والے بازاری دوا فروشوں سے اسے چھٹکارا نصیب نہ ہو سکا۔ دراصل بات یہ بھی کہ صرف تنخواہ پر کنبے کا پیٹ پالنا اس کے لئے بڑا کٹھن تھا۔ اور وہ اوپر کی آمدنیوں کی طرف دھیان دینے کے لئے کبھی تیار نہ ہوا۔ بار ہا میں نے گناہ وثواب کے نئے نئے معیار بنا کر اسے سمجھایا۔ اس کا دوسرے ساتھی کلرکوں کی زندگیوں سے موازنہ کیا۔ مگر اس کے ایمان میں ذرہ برابر لغزش نہ ہوئی۔ چڑ کر اس کے رویہ کے خلاف احتجاج بھی کیا گیا کہ "لوگ تمھاری شرافت کو کسوٹی بنا کر ہماری رشوت خوری کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔ ہم ساتھیوں کے خیال سے تو اپنا رویہ بدل دو۔" مگر یہ پتھر اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ رشوت کے خفیہ کاروبار کو میں نے اس کے سامنے بے جھجک شروع کیا۔ تاکہ وہ مجھ سے نفرت ہی کرنے لگے۔ لیکن میری یہ توقع بھی غلط ثابت ہوئی۔ پتہ نہیں یہ اس کی حد سے بڑھی ہوئی مجبوری تھی یا اور کچھ۔ وہ مجھ سے کبھی بھی نفرت نہ کر سکا۔ یہ ضرور تھا کہ وہ ہر مرتبہ مجھ سے جلد سے جلد لوٹانے کا وعدہ کرکے قرض لیتا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا وہ ادائیگی کے قابل ہی نہیں ہے۔ ہر مرتبہ وہ پچھلی رقم گن کر مجھے سنا دیتا۔ گویا اگلی تنخواہ پر پائی پائی بیباق کر دے گا۔ اور میں سمجھتا تھا یہ سلسلہ یونہی چلتا رہیگا۔ اسے اس کا سخت احساس بھی تھا کہ یہ اس کے لئے بدبختی کا بھاری بوجھ ہے۔ تب بھی وہ ہر مرتبہ اس یقین کے ساتھ مجھ سے قرض مانگتا تھا کہ میں اس کا کوئی غلط ردعمل نہ لوں گا۔ گویا اسے قرض دینا بھی مجھ پر فرض تھا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کے اور میرے تعلقات کے درمیان ایک ایسا جذبہ کارفرما تھا جسے نہ محبت کہا جا سکے، نہ نفرت، بعض وقت اس کی بیجان حرکتوں پر مجھے شدید نفرت محسوس ہوتی۔ پر میں اُسے پراگندہ و سراسیمہ بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

وہ اسکول کے دنوں ہی سے پابندی کے ساتھ ایک خانقاہ کی حاضری دینے لگا

تھا۔ جہاں ارادتمندوں کے ہجوم میں وہ بھی رشد و ہدایت کے سرچشموں سے سیراب ہوتا رہتا۔ نفسِ سرکش کو تابع فرمان کرنے اور اپنے آپ کو پہچاننے کے لئے دنیا کی ہر دلکشی پر خاک ڈالنے کی تعلیم اسے اپنی بدحال و بیمار روح کے لئے، اپنی بیزار دبے کار زندگی کے لئے ایک عجیب تسکین کا سامان بنی۔ اور اسکول کے بعد عین جوانی کے عالم میں ایک مرشد کے دستِ مبارک پر اس نے بیعت کی۔ صبر و شکر اور حلم و قناعت کو اپنا مسلک بنایا۔ اور بڑی دیانتداری سے وہ اپنی جوان جوان خواہشوں پر پہرا بن گیا۔ کیونکہ اس کا عظیم معقد اسے مطمئن کئے ہوئے تھا۔ اس کے پیش نظر تو ان صوفیائے کرام اور اولیاء اللہ کے عالی شان و محیر العقول حالاتِ زندگی تھے۔ جو اللہ کی یاد کے ساتھ ساتھ دکھی انسانوں کی خدمت اور درد دلی کی ہزاروں یادگاریں چھوڑ گئے تھے۔ مگر جن کے نام لیوا آج اللہ کی یاد سے گانجے کی چلم کا دم کھینچتے اور دنیا کی آلائشوں سے پاک ہونے کے لئے تارک الدنیا بن جانے کی تلقین کرتے تھے۔

اسے اپنے مرشد ہی سے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ یہ درجہ انہیں صرف اپنے عمل کی وجہ سے ملا تھا۔ اور وہ " عمل تھا۔ خدا کی یاد۔ اول و آخر خدا کی یاد ـــــ پھر اس نے مرشد کا عنایت کیا ہوا وظیفہ شروع کر ڈالا۔

چلّوں اور وظیفوں کی اپنی اس ناکام مہم کو بیان کرتے ہوئے وہ ایک خوابناک یادوں کی دنیا میں گم ہو جاتا۔ اس کا دماغ اس کیف و نشاط کا دیر تک مزا اٹھاتا رہتا۔ جیسے وہ فرشتوں کے نرم و نازک سنہرے پروں کے سہارے آسمان کی لا محدود وسعتوں کو چیرتا اڑا جا رہا ہو۔ یا کسی جنت کے پرسکون گوشے میں تجلیات الٰہی سے شوق دید کو طمانیت بخش رہا ہو۔ یا جنت کی نعمتوں اور حور و غلمان کے حسن لازوال سے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا رہا ہو۔ کہتا تھا وہ ان دنوں مشکل سے دو تین گھنٹے سوتا تھا۔ دن کے علاوہ

رات کا کافی حصہ نوافل پڑھتے اور وظیفے کرتے گذر جاتا۔ اور اس کی اس شب زندہ
داری کی وجہ سے پاس پڑوس میں اس کا احترام بھی ہونے لگا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے آپ
میں قربِ الٰہی کے جذب و اثر کا کچھ تھوڑا عنصر بھی محسوس کرنے لگا تھا جیسے وہ خواب دیکھتا
کہ ایک سبز پوش بزرگ اس کے سر پر ہاتھ رکھے اسے پُر امید نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔
یا دظیفے کے دوران کوئی ابابیل اس کے سر پر چکر کاٹتے محسوس کرتا۔ اور خیال کرتا کہ کوئی
خبیث روح اس کے استغراق میں خلل ڈالنے کے لئے بے قرار ہے۔ یا سوتے میں کوئی بدشکل
عورت اس کے سینے پر سوار اسے سختی سے بھینچ رہی ہوتی کہ اس کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ ہڑبڑا
کر اٹھ بیٹھتا۔ اور تیزی سے مسجد کے حوض کی جانب چلا جاتا۔ لوگ اس کی جب یہ کیفیت
دیکھتے تھے کہ آنکھیں سرخ انگارہ ہیں، داڑھی بڑھی ہوئی ہے، سر کے بال بکھرے ہوئے
ہیں۔ وہ کہیں جاتے ہوئے اپنے آپ میں گم رہتا ہے۔ بڑبڑاتے ہوئے گردن ہلاتا رہتا
ہے۔ اور جب مسجد آتا ہے تو خدا کی یاد میں کھو جاتا ہے۔ نہ اسے گھر بار کی فکر ہے نہ پاس
پڑوس کا خیال ہے۔ نہ ہی اپنے آپ کا ہوش! تو لازماً لوگوں کو اس سے دور رہنا پڑتا۔
اور ان کی دوری اس کے لئے گویا قربتِ الٰہی کا ایک واضح ثبوت تھا۔ اور اسی دھن میں وہ
خدا کی یاد میں اور زیادہ انہماک اور زیادہ استغراق اور زیادہ جوش سے لگ جاتا۔
مگر صحت اس کا ساتھ نہ دے سکی وہ ترک حیوانات کر چکا تھا پورے دن میں ایک آدھ
جوار کی روٹی یا کبھی چند کھجوریں، اور تھوڑا سا چھنا ہوا پانی، اور وہ کٹھن سے کٹھن ریاضت
کرنے پر تیار۔ اس طرح اس کی صحت گرتی ہی چلی گئی۔ اور چیخنا، چلانا، گھر سے بھاگ جانا
گھنٹوں کسی قبر کی پائینتی آنکھیں موند کر کھڑا ہو جانا۔ تالاب کی مینڈھ پر کھڑے ہو کر موت
کے متعلق سوچنا اس کا معمول ہو گیا۔ اور جب حد سے زیادہ نقاہت بڑھ گئی تو وہ بیمار پڑ
گیا۔ جوان جہان بیٹے کی اس حالت پر ماں باپ گھبرا گئے۔ انہوں نے اسے دوائیاں

پلائیں، تعویذ گنڈے کرائے، پیروں مرشدوں کے دم کرائے اور اسے دنیادار بنانے میں ایک حد تک کامیابی حاصل کی۔ پھر ملازمت کا بندوبست بھی ہوگیا۔ اور جیسے تیسے شادی بھی ہوگئی۔ لیکن جو ریاضتیں اس کے دل ودماغ میں گرمی اور جوش پیدا کر چکی تھیں ان کا یہ المناک انجام یہیں پر ختم ہو جاتا اگر وہ ان تلخیوں کو ایکبار عقل کی کسوٹی پر پرکھ لیتا۔ مگر الٹا اسے اپنی بے بضاعتی و معذوری کا احساس تھا۔ جن پر وہ قابو نہ پاکر اپنی دانست میں سب کچھ کھو دیا۔ مزید یہ کہ وہ اب بھی ان اصولوں اور لائحہ عمل کی صحت کا انتہائی معترف تھا جنا کہ شروعات ہیں۔ جس کی بنا پر وہ اپنے آپ کو انتہائی بے مقدار اور بے حقیقت سمجھنے لگا کہ اس کے نشو و نما کی قوتیں سلب ہو گئیں۔ اور اس کی زندگی سکوت و یاس کا ایک ریگزار بن گئی جس کے اطراف متصوفانہ اشعار، اولیاء اللہ کے مقولات اور ان کی کرامات کے قصہ جات کی حصار کھینچ کر اندر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا، ماحول سے کٹا کٹا موجودہ زمانے سے بے خبر بے گانہ اور دنیا سے ایسا بے تعلق کہ اس کے لئے بیسویں صدی کی زندگی ایک لعنت تھی جس میں انسان کا بھروسہ دن بدن خدا پر سے اٹھتا جارہا ہے۔ وہ بڑے جوش کے ساتھ اس کی مذمت پر اتر آتا۔ کہتا یہی سبب ہے کہ دنیا پر آئے دن محط اور جنگ نازل ہو رہے ہیں۔ پھر بھی بدی کے مرید اپنی ذات کو اس درجہ قابلِ فخر سمجھتے ہیں گویا قضا و قدر اور حیات و ممات کے سارے وسائل ان کے اختیار میں آگئے ہیں۔ عبرت کا مقام ہے لوگوں کی سمجھ میں اب بھی یہ بات نہیں آتی کہ انسان جیسے خالی ہاتھ آیا ہے واپس بھی خالی ہاتھ ہی جاتا ہے۔ حقیقت میں ہمارا اپنا کوئی گھر ہے تو صرف قبر کا چار ہاتھ کا تاریک کونا۔ ایک بھٹکے ہوئے راہی نے کسی بزرگ سے سوال کیا کہ بستی کس طرف ہے تو انہوں نے قبرستان کی طرف اشارہ کیا تھا۔" لیکن وہ مجھے متاثر نہ ہوتے دیکھ کر جھنجھلا نہیں جاتا تھا۔ برعکس میرے بے تکلف حملوں

سے اس میں اپنی حدودِ اربعہ پر نظر ڈالنے کی جرأت پیدا ہو چلی تھی۔ جمی جھلا کے یوں جواب دیتا۔ "تم بھی وہیں کیوں نہیں چلے جاتے۔" اور وہ جذبات کی تیزی کو ایک حماقت زدہ مسکراہٹ میں سمو دیتا۔

"ہنستے ہو۔"

"ہاں جانا تو سب کو ہے پر۔۔"

"کتنے دن تلک اس جھوٹی نگری میں اس بے حیا عورت کے ساتھ عیش کرتے رہو گے؟" اپنی تشبیہات کو وہ مجھے طنزاً استعمال کرتے ہوئے دیکھ کر قہقہے لگانے لگتا اور بات آئی گئی ہو جاتی ہے۔

آج آفس پہنچتے ہی میں لوگوں کے نرغے میں پھنس گیا۔ ہر چند میں نے انہیں سمجھایا کہ یہ سلیم کی ڈیوٹی ہے۔ اور وہ آتا ہی ہوگا۔ مگر لوگوں کی پوچھ تاچھ سے جان چھڑانا محال ہو گیا۔ "ابھی آجائیں گے۔" میں ان لوگوں کی بے چینی سے متاثر ہو کر کہتا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے لوگ مجھے بخش دیتے۔ لیکن لوگوں کی بے چینی کچھ دیر کی پسپائیت کے بعد پھر حملے کی تیاری میں مصروف نظر آتی۔ آخر مجبور ہو کر میں نے ان لوگوں کی عرضیاں لے کر رجسٹر کرنے لگا۔ اور جب یہ کام ختم ہوا۔ تو اپنے ٹیبل کی طرف متوجہ ہوا اتنے میں سلیم اپنی لڑکھڑاتی، ڈگمگاتی چال میں آتا دکھائی دیا جیسے بھاری بھرکم "تتیر"[1] کو کچی سڑک پر گھسیٹا جا رہا ہو۔ اور اس کا کلس دائیں بائیں آگے پیچھے پہیوں کے ہر جھٹکے پر ہل رہا ہو۔

---

[1] تیر = رتھ

اور شدید احساس ہوتا ہو کہ ابھی زمین پر گر کر پاش پاش ہو جائے گا۔ مجھے اس کا ڈگمگاتا
آج اتنا زیادہ اٹھا کر جھڑکیاں دینے کے سارے ولولے ٹھنڈے پڑ گئے۔ آتے ہی گھٹنوں پہ
ہتھیلیاں ٹیک کر چہرے پر کرب کے آثار پیدا کرکے وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور لکھنے میں منہمک
ہو گیا۔ مگر اس کا قلم چلتے چلتے رک جاتا۔ اور وہ ذرا منہ اٹھا کر خلاء میں تکنے لگتا۔ اس کا
چہرہ اور بھی زرد ہو جاتا۔ اس کے چہرے کی کھال پر خشخاش سے بھی چھوٹی سفید سفید بے شمار
گولیاں سی ابھری رہتی تھیں۔ اتنے لمبے چہرے پر سفید سفید آنکھوں کے نیچے رخساروں کی
ہڈیوں پر کبھی کبھی سرخی سی جھلکتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ بس یہی کچھ خون ہے جو اس کے جسم میں
کبھی ادھر کبھی ادھر دوڑتا رہتا ہے۔ اس کی پتھرائی ہوئی نگاہیں خلاء میں گڑی ہوئی تھیں
اور رخساروں کی ہڈیوں پہ جلد سرخ ہوتی نظر آرہی تھی۔ جیسے برسات کے موسم میں مینڈک
کی پیٹھ کی جلد پر رنگ آجائے۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر ایک بے معنی مسکراہٹ
منجمد ہو گئی ہے۔ انگلیوں میں تھکا ہوا قلم کانپ رہا ہے اور کاغذ پر لکیریں بن رہی ہیں۔ اور
وہ ایک دوسرے سے ملکر سیاہی کا دھبہ سا معلوم ہو رہا ہے۔ اور دھبہ لمحہ بہ لمحہ چوڑا اور لمبا
ہوتا جا رہا ہے۔ اچانک نیچے دیکھ کر وہ چونکا۔ اور انگلی سے اس دھبہ کو مٹانے لگا پھر اس
شکوک از خود رفتگی پر اسے جھلاہٹ ہوئی اور مجھے اپنی طرف بے تحاشہ گھورتا ہوا دیکھ
کر وہ سٹپٹا گیا۔ اس کی آنکھوں میں ندامت کی ایک غبار میں جھلک نمایاں ہوئی اور محو
ہو گئی۔ اب اس کے حواس اتنا منتشر ہو گئے تھے کہ وہ لکھنے کی لاکھ کوشش کرتا رہا مگر دلجمعی
میسر نہ ہوئی۔ وہ میز پر رکھے ہوئے فائلوں کو الٹ پلٹ کر یونہی کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ
ڈال کر کچھ تلاش کرتے ہوئے کرسی سے اٹھ کر میز کے نیچے اسٹول کے ارد گرد جھک جھک کے
دیکھتے الماری کی طرف بڑھا اور چھوٹے موٹے پرانے رجسٹروں پہ جمی ہوئی گرد کو منہ سے پھونک
پھونک کر صاف کرنے لگا۔ اور پھر آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سچ تو یہ تھا کہ اسے اس وقت

ایک ہمدرد کی ضرورت تھی اور وہ اس کے سامنے تازہ مصیبتوں کا ذکر کرکے غم کا بار ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کئی بار التجا آمیز نظروں سے دیکھا کہ میں پوچھوں کہ وہ اتنا پریشان کیوں ہے۔ مگر مجھے چپ چاپ دیکھ کر پھر سے وہ فائلیں الٹنے یا کوٹ کی جیبیں ٹٹولنے لگ جاتا۔ میں نے پوچھ ہی ڈالا۔ اس کی یہ بے چینی میری پریشانی کا سبب بنتی جا رہی تھی۔ وہ کہتے کہتے رکا۔ "کیا بتائیں بھئی!" اور ایک بیہودہ سا سانس چھوڑ کر کہنے لگا۔ "ہماری ساس نے کسی کے ذریعے آج دوپہر ہمارے چچا زاد بھائی کے ہاں کہلا بھیجا تھا کہ ہماری گھر والی سانپ کے کاٹنے سے مر گئی۔"

"ہائیں!" میں بھونچکا رہ گیا۔ اور اس گردن زدنی نے مجھے ابھی تک نہیں بتایا۔

"ہاں ہاں۔ اور وہ تمام لوگ روتے پیٹتے میرے گھر آگئے۔ اور اسے صحیح وسالم دیکھ کر یہ کیفیت سنائی۔" وہ ایک کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ میں عجیب مخمصے میں پھنس گیا۔

"بھئی تفصیل سے سناؤ۔ میں تو کچھ بھی نہیں سمجھا۔" وہ کہنے لگا۔

"بھئی دو ڈھائی گھنٹے قبل آفس آنے کے لئے میں کپڑے بدل رہا تھا۔ ایک لڑکی بھاگی بھاگی آئی اور کہنے لگی "رحیمن خالہ سانپ کے ڈسنے سے مر گئیں۔" تبھی وہ باورچی خانہ سے نکلی۔ بچی اس کی طرف اشارہ کرکے روتی ہوئی بھاگنے لگی۔ میری تو عقل چکرا گئی۔ پھر وہ لوگ بھی آگئے۔ اور ان کی زبانی یہ سب معلوم ہوا۔"

"تمھاری ساس نے یہ افواہ اڑائی تھی۔"

"نہیں بھئی قصہ کچھ اور ہے۔" اور اس نے قصہ کی مزید تفصیلات کھول کر رکھ دی۔ یہاں پر یہ واہمہ عام ہے کہ کوؤں کی جوڑی کو کوئی ملتے ہوئے دیکھ لے تو وہ ضرور

رشتہ داروں میں اپنی موت کی جھوٹی افواہ پھیلاتا ہے۔ اور یہی واقعہ اس کی ساس کے ساتھ پیش آیا تھا۔ مگر کہنے والے نے اس کی ساس کی بجائے بیوی کو مروا دیا۔

"تمہاری بیوی گھر پر ہی ہے نا" - میں نے اور اثبات چاہا۔

"ہاں بھئی وہ گھر پر ہی ہے۔ کل ہی وہ اپنے میکے سے آئی ہے۔ دو تین مہینوں سے میکے ہی میں تھی۔ وہ بھی عجیب ہے۔ جاتے وقت نہ بڑوں سے اجازت لی تھی اور نہ مجھ سے کچھ کہا تھا۔ بچوں کو لے کر چلی گئی۔ اور جب میں بھی غصہ کے مارے وہاں گیا ہی نہیں تو بچوں کے ذریعے بڑا گوشت لانے کے لئے کہلوا بھیجا تھا۔ بچے کہتے تھے ماں کا پیٹ درد اٹھا ہے۔ گوشت دلادو"۔ سانپ اور ساس کی گتھی سلجھی ہی تھی کہ میں بڑے گوشت اور پیٹ درد کے گورکھ دھندے میں پھنس گیا۔ چونکہ سلیم کی ازدواجی زندگی بھی ایسے گورکھ دھندوں کا مجموعہ تھی۔ لہٰذا میں نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔ " یار چلو عنقریب تمہارے دکھوں کا علاج ہو جائیگا"۔ اسے متوجہ پاکر میں نے اسے یہ خبر سنائی۔ "یونین کا بہت اہم جلسہ ہے۔ سینٹرل پے کمشن کی سفارشات کی بنیاد پر سمجھوتے کا امکان ہے"۔

"اچھا"۔ بظاہر اس نے کچھ دلچسپی لی۔ اور خوشی کا اظہار کیا۔ مگر پھر رجسٹروں، فائلوں کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ "مگر ان سے نبٹنا تو ابھی باقی ہے تم ہو آؤ"۔

"ڈیوٹی کا وقت ختم ہو چکا ہے گدھے کی اولاد! چلو کب تک مرتے رہو گے۔ میں کل تمہاری مدد کر دونگا"۔ میں نے اسے کرسی سے گھسیٹ ڈالا۔

کرشنا بھون سے اترتے ہی ہم نے دیکھا۔ نہرو میدان کے تنے ہوئے سینے پر لال جھنڈے تلے بھنگی، مہتر، داروغے اور کلرک غرض یہ کہ میونسپل کے

تقریباً تمام ملازم بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم بھی ان ساتھیوں میں گھس کر بیٹھ گئے۔

یونین کے سکریٹری نے گذشتہ میٹنگ کی روئیداد سے جلسہ کا آغاز کیا اور یونین کی ورکنگ کمیٹی کے مرتب شدہ مطالبات کو میونسپل پریسیڈنٹ کے سامنے پیش کرنے کی تجویز پیش کی۔ نیز عدم مصالحت کی صورت میں آئندہ اقدامات کا مکمل اختیار ورکنگ کمیٹی کو سونپنے کی درخواست کی۔

آخر میں تجویز کی حمایت میں صدر نے مزدور ساتھیوں کی افلاس زدگی کا ذکر کچھ اس انداز سے چھیڑا کہ مزدوروں کے بھوکوں مرنے، بیماریوں میں دوا دارو کے لئے ترسنے۔ ان کے معصوم بچوں کی جہالت کے اندھیرے میں بھٹکنے کا ایک دردناک نقشہ کھنچ گیا۔ جس سے مزدور ساتھیوں کے جذبات میں غم و غصہ کا ابال سا آگیا۔ اور جیسے ہی تجویز کو "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ لگا کر منظور کرنے کی اپیل کی گئی تو نبرد میدان کا سینہ دہل گیا۔ مسلسل نعروں اور شور و غوغا کی ہاؤ ہو میں میں نے سلیم کو دیکھا۔ تو مجھے سخت دھچکا لگا۔

"ہت تیری کی" کم بخت کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

اندھیرے کی چیخ

وہ میلے میں گھوم پھر کر بالکل تھک چکا تھا۔ اسے ہوٹل واپس ہوتے ہوئے ایک سایہ دار نیم کا درخت دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اور وہ درخت کے اطراف بنے ہوئے چبوترے پر چڑھ گیا۔ درخت کے مغربی رخ پر چبوترے کو لال مٹی سے لیپا گیا تھا۔ اور درخت کے تنے میں پانچ کُم کُم کی انگلیاں بٹھائی گئی تھیں۔ چونکہ ایسے گنجان شہر میں درخت پاکر تعجب اور تجسس کا جو جذبہ ابھرا تھا اس کی اہم وجہ سامنے آچکی تھی۔ وہ مطمئن ہوکر دوسری طرف تنے سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کا سارا جسم پسینہ میں شرابور ہو رہا تھا۔ وہ جیب سے رومال نکال کر دیر تک گردن اور چہرے کا پسینہ پونچھتا رہا۔

وہ اس سے پہلے بھی اس شہر کی ویران اور متعفن دوپہریں بھگت چکا تھا اس کے پیش نظر اس سفر کی غرض یاترے کی پوجا پاٹ ہوتی یا سادھو مہاراج کے درشن تو وہ یہ سب مصیبت کبھی نہ مول لیتا۔ مزے سے اپنے گاؤں کے شاداب باغیچوں میں یا تالاب کی منڈیر پہ گھنے درختوں کے ٹھنڈے سایوں میں لیٹ کر گذار دیتا مگر اس کا مقصد کچھ اور تھا۔ دل میں بیسیوں تمنائیں مچل اٹھی تھیں۔

وہ یہاں کے گورنمنٹ ہائی سکول میں دسویں جماعت تک تعلیم پا چکا تھا۔ پھر اس کے پتا جی نے اپنے گاؤں میں کھیتوں کی دیکھ ریکھ پر مامور کر دیا تھا۔ اس کے بعد کئی بار اس نے یہاں آنے کے بیسیوں بہانے تراشے۔ مگر پتا جی کی ذمہ دار گھرکیوں کے سامنے بے بس ہی ہو جانا پڑا۔ آخر یاترے کا بہانہ کارگر ثابت ہوا۔ ماتا جی کی سفارش پر دو برس کے طویل عرصے کے بعد پھر ان سوچ میں ڈوبی ہوئی بلند عمارتوں، ناچتی ہوئی سڑکوں اور ہنس ہنس کر بلاتے ہوئے ہوٹلوں، چمکارتے ہوئے سینما تھیٹروں کو دیکھنے کا موقع ملا۔

اور وہ اب تک جی بھر کر سینما دیکھ چکا تھا۔ دل میں رتّی برابر ہوس نہ رہ جائے ہوٹلوں میں بیٹھ کر پچھلی ساری کسر نکال چکا تھا۔ سڑکوں سے گذرتے پارکوں میں گھومتے ایک ایک لمحے کو کامیاب بنا چکا تھا۔

ہوا کا ایک نرم جھونکا اس کی گجرات کیپ سے اٹھکیلیاں کرتا ہوا گذرا۔ اس نے سر سے ٹوپی اتار کر ساری خنکی کا فائدہ اٹھانا چاہا۔ پسینے کی ایک دھار گال پہ سے بہتی ہوئی ٹھوڑی سے ٹپک کر قمیص میں جذب ہو گئی۔ اس نے ذرا آگے سرک کر سر بھی تنے سے ٹکا دیا۔ اور پھر آہستہ آہستہ چہرے اور سر کا پسینہ پونچھنے لگا۔ آگ بھبھوکا سورج کی قہرمان کرنیں اب ذرا ترچھی پڑ رہی تھیں۔ مگر دھوپ کی حدت ابھی تک مرچیں سی لگا رہی تھی۔

اس کی آنکھوں میں جیسے ادھر ادھر گھومتے ہوئے ریت سی چبھنے لگی۔ وہ آنکھیں بند کر کے رومال سے ملنے لگا۔ اسے اب گاؤں واپس چلا جانا چاہیئے وہ سوچنے لگا یاترا تو اب دو دن میں قانوناً بند ہو جائیگا۔ وہ کیوں نہ آج ہی چلا جائے ورنہ پتاجی کو جواب دینا مشکل ہو جائیگا۔ وہ ماتاجی کی ساری فرمائشیں خرید چکا تھا، کچور، چگسا گھاس کے پنکھے، ہراتیں، منے کے کھلونے، سیتا کے لئے گڑیاں، چوڑیاں، نیز اپنے لئے بھی اس نے ایک چیز خریدی تھی۔ مگر اس کے استعمال کا خیال آتے ہی شرم کے احساس سے اس کے نچلے ہونٹ تلے پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پیدا ہوتیں۔ ہائی سکول کے زمانے میں یوں تو جمشید کا ریزر وہ ایک مرتبہ اپنے گالوں پر پھیر چکا تھا۔ مگر پہلے ہی لمحے ٹھنڈا برف سا ریزر اس کی گرم جلتی ہوئی کھال کو گدگدا کر چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت اسے اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ محض ویسے ہی جلد بڑے ہونے کی ہوس میں جیسے وہ خاص الخاص دوستوں کی صحبت میں چھپ چھپ کر بیڑی پیا کرتے تھے — اور اب اسے ماتا پتا سے اس بدعت کو چھپا کر رکھنا تھا۔ علاوہ ایک خوف، ہونٹ، گال، ناک کی حفاظت کا بھی دامن گیر تھا۔ بالکل ویسا ہی خوف اسے مندر میں ناریل چھوڑتے ہوئے سنہری بالوں اور کالی آنکھوں والیوں سے ترچھی ٹوپی والوں کی بے تکلف ٹکریں ہوتے دیکھ کر لاحق ہوا تھا۔ مگر جب کچھ بھی ناخوشگوار واقع نہ ہوئی تو اس کا دل بھی ارمانوں کے چراغ روشن کرنے والے سینوں کے اتصال اور لوبان سا جلا دینے والی سانسوں سے لذت اخذ کرنے کے لئے بے تاب سا ہو گیا تھا۔

ایک کوے نے ڈالی پر بیٹھ کر معدہ بری طرح خالی کر دیا۔ غلاظت اس کے روبرو "تخ" سے گر کر بکھر گئی۔ وہ منہ اٹھا کر قسم قسم کی آوازوں اور ہاتھوں کی طرح طرح کی حرکات سے کوے کو اڑانے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ کمینے بڑے ضدی ہوتے ہیں۔ صاف ستھرے کپڑوں کو گندے کرنے کے بے حد شوقین۔ جہاں موقع ملے اس

نامعقول فعل سے نہیں چوکتے۔ وہ جیسے ہی اٹھنے لگا کوا اڑ گیا۔

بدقسمتی سے اسے ہوٹل بھی ایسی جگہ ملا تھا جہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ ادھ موا ہو جاتا۔ کئی بار دم گھٹ گھٹ جاتا اور بے تحاشہ جی چاہتا پاگلوں کی طرح کپڑے پھاڑ کر شور مچاتا یہاں سے بھاگ جائے۔ یہ دو تین فرلانگ لمبی گنجان آباد گلیاں کیا تھیں، گویا ان صاف و شفاف کشادہ سڑکوں اور خوبصورت عمارتوں کا "نظر تُوڑ"[1] تھیں — اور ہوٹل انہی گلیوں کے بیچ واقع تھا۔ کچے راستے کے دونوں کنارے انسانی غلاظتوں کے ڈھیر اور ہر موڑ پر دماغ اور پھیپھڑوں کو جھلسا دینے والی پیشاب کی تیز بدبو، تاریک جھونپڑوں کے آگے ایک دوسرے کے سروں میں جوئیں ڈھونڈتی ہوئی نیم برہنہ بوڑھیاں ان کے اس انہماک کو دیکھ کر جی متلا جاتا کہ وہ ضرور جوئیں چن چن کر بندروں کی طرح کھاتی ہوں گی۔ اور ہاتھ چمکا چمکا کر جھگڑتی اور ایک دوسرے کے سردوں کو آپس میں تبادلہ کرتی ہوئی چڑیل عورتیں، اور گندے بیمار اور بدصورت کیڑوں کی طرح بجبجاتے ہوئے بچوں کی فوج، گویا شاہراہوں پر ساری نفاست، ساری تابندگی، ساری تندرستی نہایت بے دردی کے ساتھ لٹائی گئی تھی اور یہ گلیاں غلاظت کے تاریک سمندر میں ڈوبتی جا رہی تھیں۔

بڑھ کر اس نے گھاس کے تنکے سے غلاظت کو صاف کرنا چاہا، تنکا ٹوٹ گیا، اور اس کی انگلیاں گندی ہو گئیں۔ اس کے چہرے پر کراہت کے آثار ابھرے اور منہ سے "تھو" کر کے نکل گیا۔

"جی" وہ ہڑبڑا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ایک نازک اندام عورت ہاتھ میں آرتی پکڑے، پھول، عود بتی اور چاول کم کم کی ایک چھوٹی سی کٹوری تھالی میں رکھے نہا دھو کر

---

[1] ۔ نظر تُوڑ ۔ نظرِ بد کا دفعیہ

پوجا کے لئے آئی تھی اور حیرت سے اس کی طرف تک رہی تھی۔

"آپ نے آواز دی تھی۔؟"

"جی۔ جی ہاں ___ آپ کب سے بیٹھے ہیں۔ میں سمجھی آپ پردیسی ہیں یوں بیٹھے بیٹھے آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"جی۔ شکریہ۔" وہ ڈرتے ڈرتے مسکرایا اور عورت کی نگاہیں زمین پر سرسرانے لگیں۔

"مگر یہاں بیٹھنے پر ہرج تو نہیں ہوتا۔"

"میرا یہ مطلب نہ تھا۔ آپ شوق سے بیٹھ سکتے ہیں۔" عورت نے تھالی چبوترے پر رکھدی۔

"شکریہ شکریہ" اور اسے اب ہاتھ دھو لینا بھی تو تھا۔ "دیکھئے۔ کیا مجھے کہیں پانی مل سکتا ہے۔ بہت پیاس لگی ہے۔

"ہاں ہاں ___ چلئے ہمارے گھر۔ وہی راستہ کے اس طرف وہ جو دروازہ کھلا ہوا نظر آرہا ہے نا۔ وہی ہمارا مکان ہے۔" عورت نے دو چار منٹوں میں پوجا ختم کی اور چل کھڑی ہوئی۔ "چلئے" وہ عورت کے پیچھے ہو لیا۔ اس عورت کی چال میں بلا کی نزاکت تھی۔ قدم اتنے ہلکے پڑتے تھے کہ کہیں گرا پڑا تنکا بھی خراش نہ پیدا کر دے۔ گھر کی دہلیز پر پہنچ کر وہ رکا۔ عورت نے مڑ کر دیکھا۔ "آئیے۔ اندر چلے آئیے نا۔" پرانے زمانے کا مضبوط مکان اونچا کم۔ لمبا زیادہ، وہ عورت اسے ایک چارپائی پہ بیٹھنے کا اشارہ کر کے ایک کالی کوٹھری میں گم ہو گئی۔ اس نے دائیں طرف مڑ کر دیکھا۔ اس کی نگاہ اندھیارے کی ایک لمبی سرنگ سے گذر کر دروازے کے پار تک گئی۔ دروازے کے اس پار ہرے ہرے چھوٹے چھوٹے پودے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ شاید پائیں باغ تھا۔

عورت نمودار ہوئی۔ اس نے منقش پیتل کے طبق میں دودھ کا گلاس پیش کیا۔ "لیجیے"

"ارے ـــ یہ آپ نے کیوں تکلیف کی۔ پانی ہی کافی تھا۔" وہ نہایت پرتکلف لہجے میں بولا۔

"آپ پی لیجئے ـــ میں پانی بھی حاضر کئے دیتی ہوں۔" وہ شعلے کی سی لپک کے ساتھ پانی لینے دوڑی اور وہ سوچنے لگا۔ یہ عورت کتنی بلند اخلاق ہے نہ جان نہ پہچان کتنی خاطر داری کر رہی ہے۔ عورت نے لوٹا لا کر رکھ دیا۔ اس نے ہاتھ پیر دھوئے اور دو چار گھونٹ حلق میں بھی اتار لیا۔

"آپ نے اپنا نام بتایا نہیں۔"

"اوہ ـــ میرا نام رمیش ہے۔ اور میں رانی پور کا رہنے والا ہوں۔" اس نے ڈرتے ڈرتے دودھ کا گلاس اٹھایا۔ کہیں اس سے اس کا ندیدہ پن تو ظاہر نہیں ہوتا، اس نے سوچا اور لب لگا کر گلاس رکھ دیا۔

"اچھا ـــ تو آپ رانی پور کے رہنے والے ہیں۔" عورت کا چھوٹا سا دہانہ کھلا، باریک بھوئیں سمٹیں اور پتلے گلابی ہونٹ کپکپائے۔

"جی ہاں ـــ آپ کو حیرت کیوں ہوئی۔" اس نے بدگمان ہوتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں ـــ میرا میکہ بھی رانی پور ہی ہے۔" اس نے گویا اطمینان کا سانس بھر کر کہا۔ "مجھے کچھ شک سا ہوا تھا کہ پہلے کہیں آپ کو دیکھا ہے۔"

"خوب" اور پھر رمیش نے اس کا پورا شجرۂ نسب دریافت کر لیا۔ کملا ایک غریب ماں باپ کی بیٹی تھی۔ یہ شاید اس کے شوہر کا گھر تھا۔ مگر اس نے پوچھا نہیں یہ کس کا گھر ہے گھر بھر سائیں سائیں کرنے لگا اور مشکوک خاموشی کے دائرے پھیلنے لگے۔

"کملا دیوی اب اجازت دیجئے۔ میں آپ کے احسان کو نہیں بھولونگا"
رمیش چارپائی پر سے اٹھا۔ وہ بے تاب سی ہو گئی۔

"نہیں نہیں ۔۔ آپ ۔۔ ابھی نہیں جا سکتے، بیٹھ جائیے نا۔"

"نہیں اب اجازت دیجئے۔ ایک ضروری کام ہے۔"

"دو گھڑی اور بیٹھئے۔ خیر۔ دیکھئے ایک بات مان لیجئے۔ آپ رات کا کھانا ہمارے ہاں کھائیں۔"

"کیوں ۔۔ اجی دراصل آج ہی میں گاؤں جا رہا ہوں۔" کملا کی اس غیر متوقع دعوت پر وہ پہلے پہل متعجب ہوا۔ اور پھر اپنے استفسار پر آپ ہی شرمندہ بھی
"دیکھئے ہٹ چھوڑیئے۔ آپ کو آج رات یہیں کھانا ہو گا۔ میں دس کے بعد آپ کی منتظر رہوں گی۔" اس کے لئے یہاں سے جان چھڑا کر نکلنا تک کارنامہ سا ہو گیا۔ اس نے وعدہ کر لیا۔ پھر وہ سیدھے ہوٹل گیا۔ اور کپڑے تبدیل کر کے بازار کا رخ کیا۔ دوپہر تک وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اب اسے گاؤں چلا جانا چاہیئے۔ مگر کملا کے اصرار نے اسے کچھ مجبور سا بنا دیا تھا کہ وہ اپنا ارادہ بدل دے۔ پتہ نہیں کملا اپنے ماتا پتا کو کوئی پیغام بھیجنا چاہتی ہو۔ شبہات پھر بھی باقی رہتے تھے کہ اسے رات کو بلانے کی کیا ضرورت تھی۔ "اوہ! ۔۔ میں تو خواہ مخواہ ایک مخمصے میں پھنس گیا"۔ لیکن اسے ایک اور تاویل سوجھی۔ عورتیں تو میکے کی دیوانی ہوتی ہیں۔ رات اور دن کی منطق ان کی سمجھ میں کیا آئے۔ وہ تو جذبات کی زبان میں بولتی ہیں۔ لیکن اب وہ کیا کرے۔ وقت کاٹنے کے لئے تو کوئی بہانہ چاہیئے۔ اور اس نے نظر اٹھائی سامنے سینما تھیٹر تھا۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ہجوم کو چیرتا پھاڑتا وہ ٹکٹ آفس کی کھڑکی تک پہنچ گیا اور ہاؤس فل کا بورڈ دیکھ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔ اب اسے ہجوم کو پار کرنا بھی مشکل نظر آیا۔ وہ لیک ایک آدمی کو

آہستہ آہستہ سرکاتا آرہا تھا کہ پیچھے سے ایک زور کا دھکا لگا۔ اور وہ گرتے گرتے بچا۔
ایک آدمی جسم پر سوائے لنگوٹ کے سارے کا سارا ننگا، موٹا مسٹنڈا، مونچھیں اوپر کو
اٹھی ہوئی، سر پر پنجابی "کراف" جھومتا، ہسمساتا، ہجوم کو دھکے دیتا چلا گیا۔ یہ ذاتِ
شریف سینما کی ٹکٹوں کی بلیک مارکیٹ کرتے ہیں اور اب شاید اپنا کاروبار ختم کرکے
تھیٹر کے اندر نعروں، گالیوں اور لڑائیوں سے تماشائیوں کے سکون کو غارت کرنے
چلے تھے۔

اور اب پھر اس کے سامنے وہی سوال درپیش تھا۔ وہ رات کے دس بجے تک
وقت کیسے ضائع کرے۔ یہ وقت بھی عجیب ہے۔ دنیا کے مانے ہوئے بڑے لوگ
شاید اپنے پاس اس کی کمی کی وجہ سے ہر قیمت پر اس کی قدر کرتے ہیں۔ مگر رمیش پان
کھا کھا کر، سگریٹ پی پی کر اسے ضائع کر رہا تھا۔ اور اس کے ضائع کرنے کے دوسرے
وسائل بھی ڈھونڈ رہا تھا گویا اس کے نزدیک تضیع اوقات ہی اس کی قیمت تھی۔

پھرتے پھراتے آرودھ سوامی مٹھ تک پہنچ کر اس نے دیکھا۔ نو بج چکے
تھے۔ "ہونڈ" میں اتر کر ذرا آگے کو جھکا اور ٹھنڈا ٹھنڈا پانی منہ پر سے بہانے لگا۔ اور سیڑھی
پر بیٹھ کر پانی میں دونوں پاؤں ڈھیلے چھوڑ دئے۔ چاندنی جیسے کسی پیغمبر کے تخیل میں الہام
کی سی نفاست اور تنویر پیدا کر رہی تھی۔ ہونڈ کے تین طرف قلمی آم کے زمین تک جھکے
ہوئے سیاہ جھنڈ سربسجود تھے۔ مٹھ کی آسمان کی بلندیوں کو چھوتی ہوئی سفید عمارت سے
ایک خاموش وقار برس رہا تھا۔ کبھی کبھی ہوا کے تیز جھونکوں سے پتوں کی تالیاں سی بج اٹھتیں
اور ہونڈ کے ٹھہرے ہوئے سیاہ پانی میں چاند کا دائرہ نما عکس پارہ پارہ ہو جاتا۔ سطحِ آب
پر بجلی سی دوڑ جاتی۔ اور چھوٹی چھوٹی لہروں کے کنارے سے ٹکرانے سے ہلکا سا شور اٹھتا
اور بھجن کے دھیمے دھیمے سروں کی مٹھاس فضائیں گھل مل جاتی۔ مگر وہ زیادہ دیر اس طرح

"ہونڈ" - کنڈ"

نواز ماحول سے لطف اندوز نہ ہو سکا۔ اور اٹھ کھڑا ہوا اور کملا کے گھر کی جانب تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

"اف ہو۔ آپ نے تو قیامت ڈھا دی۔ میں تو انتظار کرتے کرتے تھک گئی تھی۔ مگر دل کہتا تھا آپ ضرور آئیں گے۔" خوشبوؤں کا ایک مست کرتا ہوا ہجوم اسے لینے کے لئے بڑھا۔ کملا سرخ رنگ کی ریشمی ساری میں سجی ہوئی تھی۔ دہلیز کے باہر کملا کی اس بے اختیارانہ خوش آمدید سے وہ حیران رہ گیا۔ اور پاس ہی اپنے اپنے گھروں کے باہر بنے ہوئے چبوتروں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کو متوجہ پا کر کچھ پریشان بھی ہوا۔

"معاف کیجئے۔ انتظار کس بات کا۔ میں تو ٹھیک وقت پر پہنچ چکا ہوں۔"

"ٹھیک ہے پھر بھی ــ" حالات کا تقاضہ تھا وہ گھر کے اندر چلے جائیں وہ پھر اسی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ چھت سے ایک لیمپ لٹک رہا تھا جس کی روشنی اتنے بڑے صحن کے لئے ناکافی تھی۔ کملا کوٹھری میں گم ہو گئی۔ اسے محسوس ہوا اندر باہر پچھواڑے میں، کوٹھریوں میں کہیں بھی کسی مرد کی آواز نہیں سنائی دے رہی تھی اور نہ کوئی دوسری عورت یا بچہ دکھائی دے رہا تھا۔ اندر سے آواز آئی۔ "رمیش بابو! آئیے ــــ کھانا کھا لیجیے۔" دسترخوان پر کھانوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ چوکی پر بیٹھ کر اس نے دیکھا کملا اس کے روبرو بیٹھی پنکھا جھل رہی ہے۔

"آپ ـــ" وہ کھانے میں اسے شرکت کی دعوت دینے سے بھی ہچکچایا۔

"جی نہیں ـــ آپ شروع کیجئے۔"

"کیا ہرج ہے ـــ اوہ ـــ اچھا"

کھانا ختم ہونے کے بعد پان سپاری سگریٹ پیش ہوئے اور اس نے کملا سے دریافت کیا۔ "اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں۔"

"ضرور۔" کملا دستر خوان سمیٹنے لگی۔

"آپ کے شوہر کہاں رہتے ہیں۔ نہیں ـــــ دراصل میں یہ پوچھنا چاہتا تھا۔
آپ شادی شدہ ہیں۔ ارے نہیں۔ یہ بھی نہیں ـــــ آپ تو بتا چکی ہیں رانی پور آپ کا
میکہ ہے۔ ہاں ـــــ تو یہی آپ کی سسرال ہو گی۔ پھر ـــــ یہاں تو کوئی بھی نظر نہیں
آتا۔" بوکھلاہٹ میں جوں توں اس نے بات ختم کی۔

کملا ایک لمحہ اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ پھر نگاہیں نیچی کئے۔ اپنے آپ میں گم
ہو گئی ـــ" تو کیا میں ابھی تک کنواری معلوم ہوتی ہوں۔" اور تھالی کٹورے وغیرہ جلد
جلد ایک طرف سرکا کر بیٹھ گئی۔ اور کہنے لگی۔

"ہاں رہتے تو وہ اسی شہر میں ہیں۔ اور یہیں پر ایک ہوٹل چلا رہے ہیں ـــ
مگر ـــ جی ہاں، سمجھ گئی میں۔ آپ نے مجھے اس گھر میں اکیلی اکیلی دیکھ کر پوچھا تھا نا؟
اور آپ کو مجھ سے ہمدردی ہو گئی۔ لیکن دیکھئے۔ انہیں مجھ سے کچھ سروکار نہیں۔ مجھے بیاہ
کر لانے کے بعد وہ خویش اقربا تک سے قطع تعلق کر چکے ہیں۔ مگر میں ان پر کیا الزام دھروں
یہی میری قسمت تھی۔ بیچارے وہ بھی بوڑھے ہیں۔ لیکن دیکھئے اپنے کاروبار میں وہ آج بھی
کسی نوجوان سے کم نہیں۔ سنا ہے انہوں نے ایک رائس مل بھی خریدی ہے ـــ مگر آپ
چپ ہیں۔ ہاں ـــ کیا سوچ رہے ہیں آپ ـــــ خیر چھوڑیئے۔ آپ کو پریشانی
ہو گی۔

کملا کو چھیڑ کر اسے سخت پچھتاوا ہوا۔ وہ پھر بدگمانیوں میں گھر گیا۔ اور اس
مرتبہ وہ بہت گھبرا گیا تھا۔ تاہم وہ دل کو سخت باندھتا رہا تھا ـــ اتنا بدحواس ہونا ٹھیک نہیں
وہ بھوت تو نہیں جو جیب سے نکل جائے گی۔

"آپ کھا لیجئے۔ پھر بات چیت ہو گی۔" رمیش اٹھنے لگا۔ مگر کملا کو اب

کھانے پینے کا ہوش کہاں۔ وہ مرمٹنے کے لئے بالکل تیار ہو چکی تھی۔

"آپ بڑے اچھے ہیں۔" وہ جیسے اپنے آپ میں نہ تھی۔

"جی؟" رمیش اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔

"آپ گاؤں جا رہے تھے۔ مگر میرے اصرار پر نہ جا سکے۔ میں سمجھتی ہوں۔ آپ شاید خود کو اکیلا اکیلا پاکر گاؤں جانا چاہتے تھے۔ مگر آپ کو اب تنہائی محسوس نہ ہوگی۔ آپ ہر روز یہاں آیئے جی بھر کر سیر کیجئے۔ یہ شہر واقعی دیکھنے کے قابل ہے۔" کملا پورے اطمینان کے ساتھ بول رہی تھی۔ اور اسے یہ دیکھ کر رمیش سے کتنی محبت ہو رہی تھی کہ رمیش ابھی ناتجربہ کار ہے۔ وہ اس کے اضطراب کو پیاری پیاری نظروں سے دیکھتی اور میٹھی میٹھی باتیں کرتی۔

کملا کی نظر یکایک صوفے کی طرف گئی۔ لیمپ کا تیل ختم ہو چکا تھا اور گلاس کے اوپر سے باریک باریک چنگاریاں اٹھتی دکھائی دے رہی تھیں۔ بارہ بجنے کو قریب ہو گا کملا نے جھپاک سے اٹھ کر صوفے میں ایک چارپائی کھینچی اور اس پر بستر لگانے لگی۔ اور رمیش بھی اس لمبے ہی لمبے نیم تاریک صوفے میں آگیا۔ اسے کملا کے پرمسرت سائے کو ادھر ادھر دوڑتے ہوئے دیکھ کر محسوس ہوا جیسے اندھیرا کونوں میں، صندوق کی آڑ میں، چارپائیوں کے نیچے سے انہیں چھپ چھپ کر دیکھ رہا ہے۔ وہ گڑبڑا گیا۔ اور اس احساس کو بھولنے کے لئے منہ سے سیٹیاں بجانے لگا۔ لیمپ بھک بھک کی ایک لمبی سانس کھینچ کر پھٹ سے بجھ گیا۔ اور کملا کے منہ سے چٹ سی چیخ نکل گئی۔ اور وہ بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔ رمیش بے حد پریشان ہو گیا۔ "کیا ہے کملا۔ ارے تم کانپ رہی ہو۔ میں ہوں تو، خاموش کیوں ہو۔ ارے ——"

ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا، پراسرار، ناقابل عبور، جس کی پھیلی ہوئی آغوش

میں پیاسی روحیں اور بھوکی خواہشیں سیراب ہوتی ہیں۔ اگر اندھیرا نہ ہو تو اطمینان کی نیند نہ آئے۔ رمیش کو ایک لمحے کے لئے ایسا معلوم ہوا۔ اس کے سوچنے کی طاقت سلب کرلی گئی ہے وہ ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہوگیا تھا۔ جو اسے فیصلہ کرنے ہی نہ دیتی تھی۔ آخر وہ ہوش میں آکر جیبیں ٹٹولا اور اس نے دیا سلائی سلگائی۔ پھر اس نے دیکھا کہ کملا کی گرفت ڈھیلی پڑگئی اور وہ زمین پر گر گئی۔ رمیش اسے سنبھالنے کے لئے جھکا اور وہ پٹ سے بیہوش ہوگئی۔ اس نے ایک اور دیا سلائی جلائی اور باورچی خانے کی طرف دوڑا اور لالٹین اٹھا لایا۔ اور کملا کو چارپائی پر لٹا کر منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دئے۔ اور اپنے شرٹ کے دامن سے پنکھا جھلتا رہا۔ کملا تھوڑی دیر کے بعد ہوش میں آگئی اور اس کی طرف بیزارانہ نگاہ ڈال کر اٹھ بیٹھی۔

"طبیعت اچھی ہے اب آپ کی" وہ کملا کا نام لیتے ہوئے شرمایا۔

"جی! ـــ جی ہاں۔ اب آپ جائیے ـــ وہ آنہ جائیں۔" وہ نظریں جھکائے کمزور آواز میں بولی۔ اور دھپ سے گر کر چادر ٹھوڑی تک کھینچ لی۔

"میں جاؤں؟ ـــ جاتا ہوں ـــ اچھا میں جاتا ہوں۔" وہ گھبراہٹ اور شرمندگی میں پھنسا دروازے کی طرف مڑا۔ باورچی خانہ میں چھایا ہوا اندھیرا چلایا ـــ "احسان فراموش"۔ کملا نے ایک آہ کھینچ کر کروٹ بدلی۔

سفیرِ امن

ہماری شادی کو ایک آدھ سال ہی ہوا تھا اور ماموں جان عید کے لئے صفیہ کو لینے آئے تھے تو وہ میکے جانے کے لئے اتنی بے چین ہو گئی تھی جیسے وہاں دودھ پیتے بچے کو سوتا چھوڑ آئی ہو ـــــ خوشی و مسرت سے اس کے جسم کے پیچ و خم میں بیسیوں رعنائیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ وہ جب خوش ہوتی ہے تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بہار کی دیوانہ وار ہواؤں میں پھولوں سے لدی کیاریاں مستانہ وار جھوم رہی ہوں ـــــ لیکن جب والدہ نے کہا "عید کے بعد بلا لے جائیں" تو وہ تڑپ کر خاموش رہ گئی۔ مگر ماموں جان گرم ہو گئے۔ "اب ہماری بیٹی پر ہمارا کچھ بھی حق نہ رہا۔" وہ شاید صفیہ کے چہرے پر اداسی کی لکیریں پڑھ چکے تھے۔

"آپ کا کیا حق ہے۔" والدہ نے ایسے کہا جیسے انہیں یاد دلا رہی ہوں بڑے میاں! سارے حقوق ہمارے نام محفوظ ہیں۔" ہاں اگر آپ کی بیٹی آتی ہو تو لے جاؤ۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔" والدہ کا انداز بڑا جارحانہ تھا۔

"خیر جی ـــــــ یہیں رکھو۔ ہم بھی اب اس گھر میں قدم نہیں رکھیں گے۔" ماموں جان چھتری تھام کر چل پڑے۔ صفیہ بیتاب ہوگئی "ابا جان"۔ والدہ نے منہ نفرت سے دوسری طرف پھیر لیا۔ میں جھٹ سے ماموں جان کے راستے میں کھڑا ہو گیا۔ وہ ٹھہر گئے۔ "دیکھئے آپ بہت خفا ہو رہے ہیں۔ اگر آپ کی یہی آرزو ہے تو چلئے میں ابھی آپ کے ساتھ کئے دیتا ہوں۔"

"اب اس کی ضرورت نہیں۔" وہ جھپاک سے بڑھ گئے۔ میں بے کسی کے عالم میں انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ صفیہ آنسو پونچھ کر اپنے ہاتھوں میں چوڑیوں کو یوں گھمانے لگی جیسے ان کے گھمانے سے لال دیو دھم سے آ جائیگا اور ابھی سارا نقشہ بدل جائیگا اور والدہ ٹھنڈے پانی کا لوٹا چڑھانے باورچی خانے میں گھس گئیں۔

میں نے باہر سے آکر دیکھا۔ صحن میں چارپائی بچھی ہوئی تھی جس پر صفیہ ہاتھوں اور گھٹنوں کو پیٹ میں دبائے گٹھری بنی پڑی تھی۔ پیروں کی چاپ دیتا ہوا میں کوٹھڑی میں داخل ہوا۔ لالٹین کی بتی بڑھ جانے سے گلاس کا سرا کالا ہو گیا تھا۔ شال اور شطرنجی کھونٹیوں پر فالج زدہ ہاتھ کی طرح جھول رہے تھے۔ لنگی اور بنیاں صندوق پر لاوارث مردوں کی طرح پڑے تھے۔ لپیٹ کر کونوں میں رکھے ہوئے بورے ضدی بچوں کی طرح زمین پر لڑھک گئے تھے۔ مجھے یہ بے ترتیبی، بد سلیقگی نہایت شاق گذری۔ اور میں ٹہلنے لگا اور انتظار کرنے لگا کہ صفیہ آکر بستر لگا دے۔ ٹہلتے ٹہلتے میرے پیر دکھنے لگے۔ جماہیوں پر جماہیاں آنے لگیں

مگر صفیہ نے کروٹ تک نہ بدلی۔ میں خوب جانتا تھا وہ سوئی بالکل نہیں ہے۔ آواز دینے پر وہ نہایت بھونڈے پن سے بستر لگا کر پھر اسی چارپائی پر جا لیٹی۔ میں سمجھ گیا، آج پھر بادل ٹکرائے ہیں۔ اور بجلیاں کڑکی ہیں۔ بہرحال بڑھ کر میں نے اسے گود میں اٹھا لینا چاہا۔ مگر وہ تڑپ کر پھسل گئی۔ تب میں اس کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر کھینچتا ہوا لا کر بستر پر ڈال دیا۔ وہ کسمساتی، چوکھٹ پکڑتی، دیواروں سے چمٹتی رہ گئی۔ پھر خود بھی بیٹھ گیا۔

صفیہ کی سسکیاں جو بستر پر گرنے کے بعد شروع ہو گئی تھیں۔ ایک لمبے عرصہ تک جاری رہیں۔ اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے ناک کی سُڑ سُڑ پر ہچکیوں کا گماں ہوتا تھا اونی شال اپنے جسم کے گرد اچھی طرح لپیٹ کر میں لیٹ گیا۔ اور ہاتھ بڑھا کر لالٹین کی بتی کم کر دی۔ اندھیرا پھیل گیا۔ اور بتی بہت دور چمکتے ہوئے تارے کی طرح ٹمٹمانے لگی۔ اور آنکھوں پر اس کی ننھی نیلی لو کانپ کانپ کر نیند کا باریک سا پردہ ڈال رہی تھی۔

"مجھے صبح اماں کے ہاں بھیج دو۔" صفیہ بستر میں کلبلائی۔

"ہوں" میری آنکھ لگتے لگتے رہ گئی۔

"میں ایک منٹ بھی یہاں نہیں رہ سکتی۔" ایک لمحے کے لئے مجھے خیال آیا کاش یہ اندھیرا قوتِ باصرہ کی طرح قوت سامعہ کیلئے بھی دیوار بن سکتا۔ دراصل میں بہت تھکا ہوا تھا۔ اور بس سونا چاہتا تھا۔

"خیر اب سو جاؤ۔ نیند آرہی ہے" میں نے بیزاری سے کہا۔

"تم سو جاؤ۔" قریب قریب وہ چلا اٹھی۔ "میں ایک منٹ بھی یہاں نہیں رہ سکتی۔" اس کی غضب آلود حماقت پر مجھے ہنسی آگئی۔ "یوں چلاتی رہو گی تو میں سو کیسے سکوں گا۔"

"ہوں سو کیسے سکوں گا۔" میری نقل کرتے ہوئے منہ چڑائی۔

"اور یوں صبح ہونے میں سات آٹھ گھنٹے باقی ہیں۔ آرام سے سو جاؤ۔ پھر ہنسی خوشی چلے جانا۔" میں شال کو جسم سے الگ کرکے پھر گویا ہوا۔ "لیکن کیا تم والدہ سے جھگڑنا بند نہ کروگی۔" میں نے یونہی کہدیا۔

"دیکھو مجھے چور کہتی ہیں۔ میں تمہارے جیب سے پیسے چراتی ہوں۔" آواز حلق میں اٹک گئی۔ اور ہچکیاں شدت پکڑ گئیں۔

"اوہو یہ بات تھی ــــ پھر تو تم آگئے۔" میں نے کچھ دلچسپی کا اظہار کیا۔

"انہوں نے میرے صندوق کی تلاشی لینا چاہی۔ اور میں نے انہیں ایسا کرنے نہ دیا۔"

"شاباش! اور ان کا ہاتھ مروڑ کر کنجی چھین لی تم نے؟" میں نے جھوٹ موٹ بات بنائی۔

"میں ہاتھ کہاں مروڑی جی۔" وہ تڑپ کر چیخ اٹھی۔

"پھر وہ جھوٹ کہتی تھیں"۔ میں ایک جھوٹ اور جڑ دیا۔

"میں ان کا ہاتھ نہیں مروڑی"۔ وہ اپنا جملہ مستقل مزاجی سے دہرائی۔

"میں کہتا ہوں۔ ایک زمانہ ہوتے آیا۔ تم والدہ کی حالت دیکھتی آئی ہو کہ وہ نیم پاگل ہیں۔ پھر ــــ" وہ میرا جملہ کاٹ کر بڑبڑائی۔

"ہوں پاگل ہیں۔" اس کے سکڑے ہوئے پیر پازیب کے جھنکے کے ساتھ دراز ہو گئے۔

"اور پھر کیا ہیں۔ چلو ــــ تم ہی بتاؤ ــــ آج ہی فیصلہ ہو جائے۔" میں شال ایک طرف پھینک کر بیٹھ گیا۔

"وہ کچھ ہوں۔ ہمیں اماں کے ہاں بھیج دو۔" پارہ اب مائل بہ تنزل تھا۔

"میری مہربان! اگر اماں کے ہاں پہنچنے پر ابا کو معلوم ہو گیا کہ صاحبزادی "معاہدۂ امن" توڑ کر میرا مطلب ہے لڑ جھگڑ کر آئی ہیں تب دیکھنا سارے چوچلے دھرے رہ جائیں گے۔ پھر ——"

"وہ ہمیں جان سے مار دیں۔"

"ہنک ہوں —— ابا بے چارے کیا جان سے ماریں گے بھلا۔ یہی خیال ہے نا تمہارا —— جو ہٹلر کی نانی بنی ہو۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتیں۔" میں نے ذرا خفگی آمیز طنزیہ انداز میں کہا۔

"اوں —— ہٹو —— بڑے آئے آپ بھی —— ایسی ایسی گالیاں سن کر کون چپ رہے گا۔"

"چپ نہیں رہیگا تو بوریا بستر گول کریگا —— خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا دیتی ہو۔ وہ تلاشی لینا چاہتی تھیں۔ چابی پھینک دیتی تم۔ کچھ پیسے مل بھی جاتے تو کہہ دیتی میں نے ہی دے رکھے ہیں۔ اتنی بھی سمجھ نہیں تم میں۔" وہ سہم کر ٹکر ٹکر دیکھنے لگی۔

"اٹھو —— منہ پر پانی کا ہاتھ پھیر لو۔"

وہ جب منہ دھو آئی تو اسے میں نے سمجھایا۔ اس طرح لڑ جھگڑ کر گھر کے سکون کو برباد کرنے کے بجائے ایک ذرا تم ہی ان باتوں کو نظر انداز کیا کرو تو سب ٹھیک ہو جائیگا۔ اس کے ساتھ ساتھ ذرا سا روغن قاز بھی مل لیا کرو تو کیا کہنے۔ میری ساس بڑھیا احسان مند ہو نگی تمہاری۔ اور دیکھو۔ یہ اسی وقت ہو گا جبکہ تم مجھ پر بھروسہ کرنے لگو۔ اور اس گھر کو اپنا گھر سمجھ لو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں۔ اس گھر کی ساری چیزیں تمہاری ہیں جیسے کہ میری ہیں۔ جیسے کہ والدہ محترمہ کی ہیں۔ سمجھیں! —— ہاں اب یہ بات رہی کہ والدہ تمہارے ہر کام میں کیڑے نکالتی ہیں اور گالیاں دیتی ہیں۔ موقع آنے پر میں انہیں

بھی سمجھا دوں گا۔ مگر تم میکے چلے جانے کی باتیں بھول جاؤ یہ پیر تسمہ پا وہاں بھی تمہارے کندھوں پر سوار رہے گا۔" اس پر اثر تقریر پر میں اپنے آپ کو ابھی شاباشی بھی نہ دے سکا تھا کہ ہماری کوٹھڑی کا دروازہ دھڑدھڑانے لگا "شمیر ۔۔۔ او شمیر" والدہ چیخ رہی تھیں ۔ آواز کی کرختگی ارادے کی غمازی کر رہی تھی ۔ میں صفیہ کو خاموش رہنے کا اشارہ کرکے بستر میں لڑھک گیا۔ اور چراغ گل کر دیا۔ باہر والدہ گرج رہی تھیں۔ " نابکار آدھی رات گذر گئی اور نواب تک جاگ رہا ہے۔ کب سے سن رہی ہوں تیری فلو بتو۔ جورو کے غلام یہی شان ہے تیری، ارے خاموش کیوں ہے بول وہ بدذات کیا کیا کان بھر رہی تھی تیرے ۔ گھسیٹ لا اسے باہر ۔۔۔ سوچا کیا ہے اس نے"۔ اور صفیہ بھی میدان میں اتر ہی گئی ۔ "اے شرم کرو جی ۔ کیوں جہنم کا ایندھن بنتی ہو۔ مرنے کے دن قریب آئے ۔ ایسی گالیاں دے کر کیا منہ دکھاؤ گی اللہ میاں کو"۔ پھر تو یہ سلسلہ شیطان کی آنت بن گیا ۔ اور میری نصیحت کا جنازہ نکل گیا ۔ میرے وقار کا دیوالہ پٹ گیا۔

لیکن صبح اٹھ کر میں نے دیکھا کہ والدہ اور صفیہ معمول کے مطابق منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ تیار کرنے میں مشغول ہیں ۔ صفیہ تگاری پر روٹیاں تھن تھن گھڑتی جا رہی ہے ۔ اور گول گول روٹیاں تگاری سے توے پر ڈال رہی ہے ۔ اور والدہ چولہے کی آگ کو دھیمی ہونے نہیں دیتیں ۔ اور روٹیوں کو دونوں رخ سینک سینک کر "تتے" میں رکھتی جا رہی ہیں ۔۔۔ رکھتی جا رہی ہیں ۔ اور کھاتی جا رہی ہیں ۔ پکی پکائی روٹیوں کی سوندھی سوندھی خوشبو سے سارا گھر مہک رہا ہے ۔ اور جب والدہ کھا چکیں تو انہوں نے بہو کو چولہے کے آگے سے ہٹا دیا۔ اور خود روٹیاں تیار کرنے لگیں اور صفیہ کھانے لگی۔

"تتے" ۔ لوٹو کرے

گرم گرم اور تازہ تازہ کھانے کی وہ کہاں اس حد تک پابند ہیں کہ رات والی تلخیوں کو بھول بھال کر صبح شیر و شکر بن جائیں۔ میں نہیں جانتا تھا۔ لیکن مجھے اپنے اس خیال کو بھی جلد ہی جھٹلانا پڑا۔ میں نے دیکھا صفیہ کے برادرِ کلاں منہ ہاتھ دھو کر غسل خانے سے آ رہے ہیں۔ ہاں ـــــ تو ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گیا۔ چلو یہ بھی اچھا ہوا بڑے بھائی کی آمد سے ان تو بحال ہوا۔

معذرت

آپا جان کا ذہنی بکھراؤ انہیں ڈھنگ کا فیصلہ کرنے نہ دے رہا تھا۔ ایک طرح سے انہیں شکایت تھی کہ تسنیم یہ کیا کر بیٹھی۔ ذاتی طور پر وہ عشق و محبت کو سوائے تباہی کے اور کچھ تصور نہ کرتیں۔ کتنی کہانیاں انہوں نے سن رکھی تھیں کہ اس میں گھر کے گھر تباہ ہو جاتے ہیں، سر کٹ جاتے ہیں اور کبھی کبھی اندر ہی اندر باپ بھائی پھانسی دے کر "کھووں"[1] میں پھینک دیتے ہیں۔ "اڑ گاروں"[2] جنگلوں میں گلا گھونٹ کر دفن کر دیتے

---

[1] ۔ کھووں: برس کے برس اناج کو کیڑوں وغیرہ سے محفوظ رکھنے کیلئے زمین میں کھودے گئے بیس تیس فٹ گہرے گڑھے جنکے دہانوں کو مٹی سے بند کر کے زمین کے برابر کیا جاتا ہے [2] اڑ گار جنگلوں: بیابان جہاں کوسوں تک پانی اور درخت نہ ہوں۔

ہیں۔ بوٹی بوٹی کر کے تھیلوں میں بھر کر جھاگ اڑاتی دریاؤں میں بہا دیتے ہیں۔ اور پھر یہ ان کی آنکھوں دیکھی بات تھی۔ جب وہ ابھی پردے میں نہ بٹھائی گئی تھیں۔ شمسہ کے بھائی بند ایک نوجوان کو مار مار کر لہو لہان کر رہے تھے اور وہ نوجوان مار کھاتا جاتا اور شمسہ کی بڑی بہن کا نام لے کر زور سے چیختا اور ٹوپی ہوا میں اچھال کر دیوانہ وار قہقہے لگاتا۔ اس کی خونیں آنکھیں، سر کے خشک کھڑے ہوئے بال، سوجا ہوا منہ، اس کی بے اختیار حرکتیں۔ وہ ڈر کر اپنے گھر بھاگ آئی تھیں۔ کیا معلوم وہ انہیں بھی دبوچ کر ٹوپی کی طرح ہوا میں نہ اچھال دے۔ لیکن ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ لڑکیاں پڑھ لکھ کر کیا ہی کچھ کرتی ہیں۔ تسنیم کو تو ابا جان محض اس کا دل رکھنے کے لئے اسکول بھیج رہے تھے۔ ورنہ اماں جان سرے سے ہی اس کے خلاف تھیں۔ وہ تو خیر ابا جان کی دھمکی تھی کہ آج کل پڑھی لکھی لڑکیوں کو ہی اچھے بر ملتے ہیں کام کر گئی، اور وہ خاموش ہو رہیں۔ ورنہ یہ حقیقت تھی کہ آپا جان تسنیم کی عمر میں دو بچوں کی ماں بن چکی تھیں۔ لیکن ایک تسنیم ہے کہ اسکول کے بہانے یہ گل کھلا بیٹھی۔ اب اگر یہ خبر ابا جان سن لیں تو کیا ہو۔ وہ خود کیسے حواس کھو بیٹھی تھیں۔ پہلے پہل جب یہ کہانی تسنیم نے انہیں سنائی تو اس کی یہ بات کیسی عجیب معلوم ہوئی تھی۔ اور پھر جیسے انکے تنفس میں پانی بھر گیا ہو۔ سانس اترتی ہی نہ تھی۔ مگر وہ جلد ہی تسنیم کی مُردوں کی سی حالت دیکھ کر بے قرار ہو گئی تھیں۔ اپنے ہی بچوں کی طرح وہ ان کے گودوں پلی تھی۔ اور اس کی بڑی سی بڑی شرارت کو بھی وہ ممتا میں ڈوبی ہوئی جھڑکیوں سے درگذر کرتی تھیں۔ لیکن اس کے چہرے پر کھنڈی ہوئی زردیاں اور آنکھوں میں بسی ہوئی ویرانیاں دیکھ کر وہ بے قرار ہو اٹھی تھیں اور انہیں جیسے اپنا بچہ دم توڑتا ہوا سا معلوم ہوا تھا۔ اور وہ تسنیم کے گلے میں باہیں ڈالکر اتنا روئیں، اتنا روئیں کہ تسنیم خود انہیں دلاسا دینے لگی تھی۔ اور پھر انہوں نے موقع تاک کر نرمی کے ساتھ اس خیال کو دل سے نکال دینے کو بھی کہا تھا۔ اور ظہیر کی بیسیوں

خوبیاں جتائی تھیں۔ مگر وہ بضد تھی۔ "کچھ بھی ہو۔ میں یہ نہیں کر سکتی"۔ وہ تیزی سے ٹہلنے لگی تھی۔ "بتاؤ آپا۔ میں کیا کروں"۔ وہ ایک دم پلٹ کر ان کے قریب آکر ٹول ٹول آنکھوں سے دیکھنے لگی تھی۔ وہ الطاف کو دھوکا دینے کے بجائے مر جانا اچھا سمجھتی تھی۔ اور آپا جان کو بار بار اس کی زبان سے الطاف الطاف سن کر غصہ بھی آ رہا تھا۔ غارت ہو جائیں ایسے لوگ، اچھی بھلی لڑکیوں کو یوں ورغلاتے ہیں۔ اور یہ مُردی بھی کس روانی سے اس کی باتیں کر رہی تھی۔ جیسے وہ اس کی بہت ہی پیاری سہیلی ہو۔ یوں غیر مرد کا نام اپنی زبان پر لاتے وہ ذرا بھی نہ شرمائی تھی۔ لیکن یہ ہی کیا کم بے غیرتی تھی کہ اس نے کسی مرد سے چپکے چپکے ایسا گہرا لگاؤ قائم کر لیا تھا۔

جب سے ظہیر کی بات چھڑی تھی۔ ابا جان نے اس کا کالج جانا بند کر دیا تھا۔ اور یہ کوئی بری بات بھی نہ تھی۔ لوگ نام رکھتے تھے کہ اتنی بڑی لڑکی ہو گئی اور ابھی تک پردے میں نہیں بٹھائی گئی۔ مگر اس کے لیے تو جیسے دل و دماغ سے سرتوں کا احساس نچوڑ لیا گیا تھا۔ گھنٹوں کھڑکی میں کہنیاں ٹکائے ہتھیلیوں پہ ٹھوڑی رکھے کہیں دیکھ رہی ہوتی۔ مسلسل دیکھے جاتی۔ اتنی بے خبر اور بیگانہ کہ کوئی چور اچکا کانوں سے جھمکے بھی اتار لے تو معلوم نہ ہو۔ سارا دن ساری رات بستر پر پڑی تکیہ بھگوئے جاتی۔ کبھی وہ اس کے کمرے میں گئیں تو لگی گلے میں باہیں ڈال کر آنسو بہانے۔ اور اس کے یہ گرم گرم آنسو، یہ "بل بل[1]" گر کر بکھرتے جذب ہوتے آنسو، بلبلاتے گڑگڑاتے آنسو یاد آتے ہی انہیں بے چین کر دیتے تھے۔ اور ان کا موڈ بدل جاتا۔ پھر وہ سوچنے لگتیں کہ آگے کیا کرنا چاہیئے۔ اپنی طرف سے وہ ظہیر کو اماں جان کے سامنے بدنام کرنے اور اسے بیکار و نالائق ثابت کرنے میں پورا زور

---

[1] - بل بل : ٹپ ٹپ

صرف کر چکی تھیں۔ اور انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اماں جان کے دل میں شکوک پیدا ہو گئے ہیں اور توقع تھی کہ وہ ضرور ابا جان سے ان کے پیدا کئے ہوئے شکوک کا ذکر کریں گی۔ اور جب مزید پوچھ گچھ کے لئے بلایا جائے گا تو انہیں پوری کوشش کرنی چاہیئے کہ ابا جان بھی ان کے قائل ہو جائیں۔ دو تین روز اسی انتظار میں گذر گئے کہ ابھی انہیں بلایا جائیگا۔ اماں جان کو باورچی خانہ میں مدد دیتے ہوئے وہ منتظر رہتیں کہ اماں جان باتوں میں ظہیر کا ذکر چھیڑ دینگی۔ دوپہر جب وہ سینے پرونے یا کسی اور کام میں مصروف دکھائی دیتیں ان کے دل میں کانٹا سا کھٹکتا رہتا کہ اماں جان اب پوچھیں گی اسی طرح رات آجاتی۔ اور اماں جان بستر پر بیٹھے بیٹھے ادھر ادھر کے ہی جھگڑوں میں گتھ جاتیں۔ اس موضوع کی طرف اشارہ تک نہ کرتیں۔

اگرچہ انہیں یقین تھا کہ اماں جان ابا جان سے وہ سب کچھ بتا چکی ہوں گی مگر ان کی خاموشی حیرت خیز و تکلیف دہ تھی۔ اور تسنیم کے پریشان کن سوالات کا ان کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ "تو چپ رہ تسنیم! میں سب کچھ ٹھیک کر لوں گی"۔ یوں کہنے میں کم سن بہن کو خوش دیکھنے کے سوائے اور کوئی جذبہ نہ تھا۔

بظاہر اس ترکیب کی کامیابی کے امکانات نظر نہیں آرہے تھے۔ اگر کامیاب ہو گئی تو تسنیم کی قسمت سمجھ لینا چاہیئے۔ ورنہ وہ کھلم کھلا اماں جان کے سامنے تسنیم کی بغاوت کا تذکرہ یا حمایت کرنے سے رہیں۔ وہ کر بھی کیا سکتی تھیں۔ ان کا دل ہی اس جسارت کو معاف نہیں کر سکا تھا۔ تسنیم کی ہمدردی میں کام کرنے کے لئے ان کے دل میں امنگ ہی پیدا نہ ہوتی تھی۔ ان کی سوچ ہر پھر کر مایوس نتیجہ پر ہی پہنچ جاتی تھی۔

ابا جان کو اچانک اپنے خاوند کو یہاں آدھمکنے پر جو تعجب ہو رہا تھا اماں جان نے یہ کہہ کر رفع کیا۔ "جمیلہ آج ظہیر کے گھر سے رسم آئیگا۔ تم تسنیم کو نہلا دھلا دو۔ اور دیکھو اندر

کی کوٹھری میں صندوق کے اوپر کپڑے اور زیورات رکھے ہیں تسنیم کو پہنا دو۔ میں تمہاری خالہ جان کو بلا لاتی ہوں"۔ آپا جان مبہوت رہ گئیں۔ جیسے دیکھتے دیکھتے ان کے سامنے جھاڑ پہاڑ چلتے پھرتے، ہنستے بولتے معلوم ہونے لگ جائیں۔ "بات چیت پکی ہوگئی مگر کہاں" وہ دل ہی دل میں بہت گڑگڑائیں کہ وہ اب تسنیم کو کیا منہ دکھائیں گی۔ ان کی عملی قوتیں جواب دے گئیں۔ وہ تسنیم کا خیال کر کے شدید کوفت میں مبتلا ہو گئیں۔ یہ خبر سن کر اس بیچاری کا برا حال ہوگا۔ اس کے دردمند دل کو اور دھچکا لگے گا۔ اس کا چاند سا چہرہ گہنا جائیگا ــــ وہ سمجھے گی۔ "آپا کمینی ہیں"۔ وہ اسے جھوٹی تسلی دے کر دھوکہ دیتی رہیں۔ پھر اس کی پیٹی آنکھیں ہاہیں ان کی طرف کبھی نہ اٹھیں گی۔ ان کی جھڑکیوں پر وہ اب بچوں کی طرح اداس ہوں نہ کہے گی۔

شام تک وہ تسنیم کے پاس جائے یا نہ جائے کی کشمکش میں خاوند کے پاس سے دیوان خانے میں۔ دیوان خانے سے باورچی خانے میں گھومتی رہیں۔ اور یہ سوچ کر کہ جو ہوا سو ہوا۔ ہمت کر کے انہوں نے وہ کپڑے اور زیورات بھی دیکھ لئے۔ جو اماں جان تسنیم کو پہنانے کے لئے کہہ گئی تھیں۔ بڑھیا قسم کی لس لس کرتی ہوئی ساڑھی اسے پہن کر تسنیم برسات کی صبح کی طرح نکھر آئے گی۔ انہیں ایک ذرا خوشی بھی محسوس ہوئی۔ پھر جب ظہیر کے گھر سے ان کا نوکر پیغام پہنچا گیا کہ وہ لوگ دو ڈیڑھ گھنٹے میں آجائیں گے" تو ان کی بے قراری اور بڑھ گئی۔ خالہ اور اماں جان ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ ان کے آنے سے پہلے تسنیم کو تیار کرنا چاہیئے تھا۔ مگر ان کے پیر تسنیم کے کمرے کی جانب اٹھتے ہی نہ تھے۔

"آپا جان آپ کو تسمی آپا بلا رہی ہیں"۔ فخرو کہہ گیا اور وہ دیوان خانے میں بے مقصد ٹہلتی رہیں۔ پھر اپنے آپ کو مصروف دکھلانے کے لئے سجے ہوئے دیوان خانے پر تنقیدی نظریں دوڑائیں۔ کونے میں سرکائی ہوئی میز، کرسیوں، صندوق، الماریوں

کو دیکھ کر انہیں ایک لمحہ کے لئے خیال ہوا۔ کہ اس کوڑے کباڑ کو کسی دوسرے کمرے میں اٹھادیں۔ تو دیوان خانے میں تنگی محسوس نہ ہو۔ پھر انہوں نے مہمانوں کے بیٹھنے کے لئے بچھی ہوئی سفید چاندنی اور گاؤ تکیوں کو درست کیا۔ پاندان، سگریٹ کاٹن اور دیاسلائی کی ڈبیا کو گاؤ تکیوں کے قریب کھسکادیں۔ اب ہر چیز گویا اپنی جگہ جمی ہوئی اور درست تھی۔ اور ان کی نظر اوپر اٹھی۔ قرآنی آیات، نعتیہ قطعوں اور دعاؤں کے خوشخط طغرے مکہ معظمہ مدینہ منورہ کی تصویریں دیوار پر دوانچی تختہ کے سہارے نہایت سلیقہ سے جھکے ہوئے انداز میں کھڑی کردی گئی تھیں۔ ان کی نگاہیں فرطِ احترام سے جھک گئیں۔ اور جی میں آیا۔ "پلّو پسار کر کچھ مانگ لوں۔ اپنے دل کی تسکین ــــ تسنیم کی مرتیں۔" اور وہ وہاں سے ہٹ کر پچھواڑے میں کھلی ہوئی کھڑکی سے دیکھنے لگیں۔ سورج نیم کے درختوں کے جھنڈ میں غروب ہو رہا تھا۔ مغرب سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ سارا دن جلتی دھوپ میں کھڑے ہوئے پودے دھیرے دھیرے گردنیں ہلا رہے تھے اور تھوڑی دیر میں کالی رات اس راحت بخش ماحول کو اپنی آغوش میں لینے والی تھی۔

"فخرو" نوکر کو آواز دیتی ہوئی وہ وہاں سے مڑیں۔ اور تلنے کے برتن کو چولہے کی راکھ سے مانجھتے ہوئے فخرو سے کہنے لگیں ــ "فخرو دیوان خانے میں تھوڑا سا عود جلادے۔"

"اچھا آپا۔" فخرو ہاتھ دھو کر اٹھا۔

اور وہ پچھواڑے میں موگرے کی کلیاں چننے لگیں۔ نیم کے درختوں میں مینائیں چیخ رہی تھیں، ہلکی پھلکی نیولیاں چوس رہی تھیں، باتیں کر رہی تھیں، لڑ رہی تھیں، ڈالی ڈالی پھدپھدا رہی تھیں، غصیلی مینائیں ــــ کیا مجال کالا کوا ان کے گھونسلے کے پاس بھی پھٹکے۔ اور آپا جان کلیاں چن رہی تھیں سفید سفید روئی جیسی جو ابھی کھلی تک نہ تھیں۔ جن کی خوشبو ابھی پیٹ ہی میں تھی۔ راز کی صورت ــــ سورج غروب ہو گیا تھا۔ تاریکیاں

روشنی کے ذرے ذرے کو نگلتی جا رہی تھیں، سناٹا تھا، تاریک سناٹا اور وہ اس سناٹے میں کھو گئیں۔

پھر وہ گھر میں بیچ بیچ باتیں سن کر چونکیں لال جان آ گئی تھیں اور یہ سوچ کر انہیں گھبراہٹ ہوئی کہ تسنیم کو ابھی تک تیار نہ دیکھ کر وہ بہت خفا ہونگی اور کوئی بہانہ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت تک وہ بے کار ہی گھومتی رہیں۔ اور جب انہوں نے گھر میں قدم رکھا تو خالہ جان کی آواز سنائی دی۔ وہ تسنیم کو نہلا کر کپڑے پہنا رہی تھیں۔ ابا جان دیوان خانے میں گیس بتی (پیٹرومیکس) کو چھت کی شہتیر سے رسی باندھ کر لٹکانے کا مشورہ دے رہے تھے۔ اماں جان پڑوسنوں کے ساتھ باورچی خانے میں مصروف تھیں۔ دیوان خانے میں محلے کے بزرگ، بچے، جوان بھرے ہوئے تھے۔ سارا گھر روشنیوں اور خوشیوں سے معمور تھا۔ پھر ابا جان سمدھیوں کے انتظار میں اندر باہر پھرنے لگے تھے۔ کئی بار آپا جان کی اماں جان سے مٹھ بھیڑ ہوئی مگر وہ ان کی طرف توجہ تک نہ دے سکیں۔ اور جب اماں جان کسی کو کچھ لانے یا لے جانے کو کہتیں تو وہ جھٹ سے اس کام کو کر دیتیں۔ مگر اماں جان کی بے اعتنائی بدستور قائم تھی۔ مجبوراً انہیں باورچی خانے سے اٹھنا پڑا اور انہیں خیال ہوا تسنیم کو دیکھ آئیں۔ اسے دلہن بنے ہوئے دیکھنے کے ارمان جاگے۔ مگر ان سے اس کی جرأت نہ ہو سکی۔ تھک ہار کر وہ خالہ جان کو ڈھونڈنے لگیں۔ ان کا دل آج کسی سے گھنٹوں باتیں کرنے کو چاہ رہا تھا۔ مگر خالہ جان کو اتنی فرصت کہاں تھی۔ ایک دو باتوں کے بعد ادھر ادھر دوڑی دوڑی چلی جاتیں۔ پھر اس تنہائی سے ان کا دل رونے کو چاہنے لگا۔ مگر اس خوشی کے موقع پر رونا آئے بھی تو کیسے؟ پھر انہوں نے اپنے بچوں کو یاد کر کے جو تمام کے تمام اللہ کو پیارے ہو چکے تھے ادھر ادھر دیکھ کر اس خواہش کو پوری کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔

توڑوں کڑوں کی جھنکار اور سلام و دعا کی بھرمار سے انہیں پتہ چل گیا کہ سمدھنیں

آگئیں۔ اور اماں جان کی فیاضی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے قدمبوسی اور آداب عرض کے جواب میں کنواریوں اور بیواؤں تک کو سہاگ سلامت کی دعائیں دے ڈالیں جس سے فضا کبھی کھن کھن قہقہوں سے گونج اٹھتی، کبھی غم اندوز احساس کی طرح بوجھل ہو جاتی۔

اماں جان کو جب انہوں نے اس ہجوم کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف آتے دیکھا تو یہاں سے بھی کھسکنا پڑا۔ دو عورتیں دیوان خانے کی طرف جھانکتے ہوئے تسنیم کے کمرے میں گھس رہی تھیں۔ انہوں نے بھی یہی بہتر سمجھا۔

"اے ہے۔ دلہن کے کمرے میں تو کوئی بھی نہیں۔"

"آؤ بہن" آپا جان نے تسنیم کے روبرو دو چار کرسیاں گھسیٹ کر سمدھنوں کو بٹھایا۔ تسنیم نے پلو کھینچ کر گھونگھٹ کر لیا۔ سمدھنیں ٹانگوں، پلکوں کو کوسنے لگیں کہ ان کے جسم کا جوڑ جوڑ ہل گیا ہے۔ پھر انہوں نے راستے میں دیکھی ہوئی عمارتوں، دوکانوں اور لوگوں پر متحیرانہ گفتگو کرنے لگیں۔

"سیدھی بیٹھو دلہن"۔ ایک نے دلہن کی تکلیف کا احساس کیا۔ "کتنی گھٹن ہے ــــ اے ہے، دلہن تو شرماتی ہی جا رہی ہے۔ توبہ ہٹاؤ بھی، ہم غیر تھوڑی ہیں۔" اور خود ہی مسکراتے ہوئے تسنیم کے منہ پر سے پلو ہٹانے لگی۔ تسنیم کرسی کے ہتے پر ہاتھوں سے منہ چھپائے جھک گئی۔ دلہن کا کمرہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے دو چار اور آگئیں۔ اور دلہن کو گھیرا ڈال کر کھڑی ہو گئیں۔ دیوان خانے میں شور سا اٹھا۔ سمدھیاں آگئے تھے شاید۔ تسنیم ان لوگوں میں پھنسی کرسی میں دبی جا رہی تھی۔ آپا جان ہجوم کو چیر کر تسنیم پر جھک گئیں۔ "نا بھئی ہم یوں نہ دیکھنے دیں گے۔ پہلے "اجالا" رکھو۔"

"کیوں، گھونگھٹ الٹتے ہی اندھیرا ہو جائے گا۔" فضا بے لگام قہقہوں سے جھنجھنا اٹھی۔

"بیگم اجالا نہیں سمجھیں۔ اجالا یعنی چاندی، پانچ روپیہ، دس روپیہ، بیس روپیہ میرا مطلب ہے اپنی حیثیت کے مطابق یہ اتنی قیمتی چیز ہے کہ صرف دیکھنے کا ہدیہ ہے یہ۔"

"اوہو یہ بینچوں، کرسیوں، گدیلی کرسیوں کا ریٹ معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہاں تو ایک دو پرانی کرسیوں کے سوائے کچھ بھی نہیں۔" قہقہے پھر دیواروں اور چھت سے ٹکرائے۔ اور ان قہقہوں میں حلیمہ کی آواز دب گئی۔ جو دروازے میں کھڑی ان عورتوں کو بلا رہی تھی، اور اس کا نوٹس نہ لینے پر ناک بھوں چڑھا رہی تھی۔ مردانے میں قول و قرار اور فاتحہ کی رسم ختم ہو گئی تھی۔ زنانے میں زیورات، کپڑوں، شکر، پان سپاری، مصری بادام کھجور کے بڑے بڑے برتن جار جبٹ کے رنگین سرپوش اڑھائے بھیجے جا رہے تھے۔ پھر مردوں میں شکر، پان تقسیم ہوئے اور ایک آدھ گھنٹے میں دیوان خانہ خالی ہو گیا۔ اور وہ عورتیں حلیمہ کی طرف پلٹ پڑیں۔ اب وہ کمرے میں دو ہی تھیں۔ تسنیم کی خاموشی اتنی سنگین تھی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی اس سے ٹکرا کر سر بھی پھوڑ لے تو نہ ٹوٹے گی۔

"تسنیم!" ہتھیلیوں میں بھر کر وہ اس کا چہرہ اٹھائیں۔ آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر کوئی تازہ تاثر پیدا نہ ہو سکا۔ آنکھیں بدستور بند رہیں جیسے آنسوؤں کو یوں ضائع ہونے سے وہ بچا رہی تھیں۔

"مجھے معاف کر دو بہن۔" وہ دکھ کے ایک چڑھتے ہوئے دھارے کو روک نہ سکیں۔ "میں نے اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ تم مانو اس منگنی کی مجھے آخری لمحے تک خبر نہ تھی کہ آج ہی ہے۔" وہ تسنیم کے چہرے کو چھوڑ کر اپنے آنسو پونچھنے لگیں "میں سمجھتی ہوں۔ یہ راز ان پر فاش ہو گیا ہے۔ اسی لئے انہوں نے اتنی جلدی کی ہے۔ اور ظہیر کی برائی کرتے پر وہ مجھ سے بھی بدظن ہو گئے ہیں۔"

ایک لمبی خاموشی ان دونوں کے درمیان مسلّط رہی۔ اور پھر ایک ادر عورتوں کا غول کمرے میں در آیا۔ وہ اب کھانا کھا چکنے کے بعد دلہن کے گود بھرنے، پھول پہنانے اور دوسری پھیری کے رسم کے لئے دلہن کو اٹھانے گئیں۔ اور آپا جان نڈھال ہو کر ایک کرسی پر لد گئیں۔ عورتیں رات بھر دیوان خانے پر قبضہ جمائے رہیں۔ ڈھول کی بدہنگم آواز میں بادا آدم کے زمانے کے شاعروں کے گیت گلا پھاڑ پھاڑ کر گائے گئے۔ نقلیں اتاری گئیں۔ قہقہے پڑے، آوازے کسے گئے اور رات کے تین بجے تک حشر ملبر پا رہا۔ اور آپا جان کرسی پر لدی کی لدی رہیں۔

کھوکھلے سپنے

الطاف کے بی۔اے پاس کرنے کی خبر مقامی اخبار کے دفتر سے فون کر کے ہم نے معلوم کر لی تھی۔ اور معمول کے مطابق چائے پی کر ریلوے گراؤنڈ آ گئے۔ نہ مٹھائیاں کھائیں اور نہ ہی سینما دیکھا۔

الطاف اور شکیل ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر تھے۔ اور ساتھ ساتھ کالج میں داخلہ بھی لے رکھا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد شکیل کو یہ گوارہ نہ ہوا کہ وہ لڑکوں کے ساتھ مغز پاشی بھی کرے اور بی۔اے کی پڑھائی بھی جاری رکھے۔ دراصل درس و تدریس کے فرائض کی ادائیگی کے لئے ہی وقت پورا نہ پڑتا تھا۔ پھر وہ بی۔اے کی کلاسوں میں کیا حاضری دے سکتا تھا۔ وہ امتحان کو سرے سے ہی بھول چکا تھا۔ اور الطاف کی کامیابی

سے اس کے چہرے پر آج کچھ کچھ ندامت کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ لیکن یہ آثار اتنے دو ٹوک بھی نہ تھے کہ کوئی ان سے متاثر ہو کر قسم کھا سکے کہ وہ آئندہ پڑھائی کریگا۔ اور ضرور کامیاب ہو جائیگا۔

شکیل دونوں ہاتھوں کا تکیہ لیکر سوکھی مری ہریالی پر چت لیٹا ہوا تھا۔ اور نہیں معلوم کیا سوچ رہا تھا۔ گراؤنڈ میں تفریح کو آئے ہوئے لوگ دو دو چار چار کے گروپ میں بیٹھے ہوئے تھے ٹہل رہے تھے، سگریٹ پان سے شوق کر رہے تھے چنے اور مونگ پھلیاں کھا رہے تھے۔ پاس ہی ایک نوجوانوں کی ٹولی گلے بازی میں مصروف تھی۔ اچھا خاصہ اندھیرا ہو گیا تھا مگر چند منچلے ابھی تک کرکٹ کھیل رہے تھے۔ کوئی ایسا موضوع الطاف کو بھی نہیں مل رہا تھا کہ باتوں کا سلسلہ ہی شروع کر دے۔ وہ اپنا نتیجہ سن کر اس قدر بدحواس ہو گیا تھا کہ توازن کھوئے ہوئے بزرگوں کی طرح سوچنے لگا تھا کہ لوگ کتنے بدتمیز ہیں اسے سلام کیوں نہیں کرتے۔ وہ بی اے پاس کر چکا ہے۔ یا شریر بچوں کی طرح آس پاس پڑے ہوئے ٹھیکرے اٹھا کر اس زور سے پھینکتا کہ فضا میں سیٹیاں سی بج اٹھتیں۔ آج صبح سے نتیجہ نکلنے تک وہ کافی پریشان رہ چکا تھا۔ لوگوں کے ہلتے ہوئے ہونٹ اسے کچھ پوچھتے ہوئے معلوم ہوتے۔ لوگوں کی آنکھیں اس کے لئے سوالیہ نشان بن جاتیں۔ اور اسے لوگوں کے چہرے، حرکات و سکنات پر سوچتے غور کرتے ہوئے وحشت ہونے لگتی۔ تو وہ اپنے کمرے کو بند کر کے اکیلا اکیلا لیٹ جاتا۔ اسے جس شدت سے تین بجنے کا انتظار تھا۔ (شکیل کو لے کر پوسٹ آفس چلتے ہوئے دتا کہ مقامی اخبار کے دفتر سے ٹیلیفون پر اپنا نتیجہ حاصل کر سکے) اس سے بڑھ کر کوفت ہونے لگی تھی۔ وہ سوچنے لگا تھا اس وقت اس کے ناکامیاب ہونے کی خبر سے سب یہی محسوس کریں گے کہ وہی ایک ناکامیاب ہوا۔ کاش پوسٹ آفس ایک دن کے لئے

غائب ہو جاتا۔ اس کے ذہن میں کچھ عجیب سی کھد بد ہو رہی تھی۔ جتنا وہ اپنا نتیجہ معلوم کر لینے کے لئے بے قرار تھا۔ اتنا ہی اس کے معلوم نہ ہونے کی دعائیں بھی مانگ رہا تھا۔ بات یہ تھی اسے اپنی کامیابی کی امید نہ تھی۔ وہ جیسے ہی ایک ماہ کی رخصت لے کر پڑھائی کو بیٹھا اس کی صحت بگڑ گئی تھی۔ اوّل تو اس کے دماغ پر یہ خوف طاری تھا کہ ایک ماہ کی رخصت کامیابی کے لئے گیارنٹی نہیں ہے، کھانسی بخار نے مزید ستم ڈھایا۔ آخر بیماری کی طوالت سے چڑ کر اس نے کتابیں پھینک دیں اور لیٹ گیا۔ مگر منٹ منٹ کو اٹھتی ہوئی کھانسی نے اس کا پیچھا امتحان کے کمرے میں بھی نہ چھوڑا تھا۔ کھانسی اس زور سے اٹھتی تھی کہ وہ قلم ڈیک پر رکھ کر گلا دبانے لگتا۔ دو تین منٹ بعد کھانسی دب جاتی تو وہ دیکھتا تھا۔ سارا جسم پسینہ سے تر بتر ہو گیا ہے۔ پھر قلم اٹھا کر لکھنا شروع کرتا۔ پرچہ ختم ہونے تک اس کے کئی بار کھانسی اٹھتی تھی، کئی بار وہ گلا دباتا تھا، کئی بار پسینہ میں نہا جاتا تھا اور کئی منٹ ضائع ہوتے تھے اور پرچہ لکھ کر جب وہ مکان آتا تو بخار کی ہلکی ہلکی آنچ میں جلتا رہتا تھا۔ پھر ساری رات کروٹیں بدلتے، پانی پیتے، آنسو بہاتے گذار دیتا۔ تب بھلا اسے کامیابی کی امید ہو تو کیونکر ہو۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ اپنی ذہانت سے ناامید بھی نہ تھا۔

ادھر اس کے ماں باپ کے تقاضے تھے، شکایتیں تھیں کہ وہ اب بڑھاپے کی وجہ سے روزی کمانے سے معذور ہیں۔ کمر جھکے پر ان سے اب ایک گھنٹہ بھی بیٹھا نہیں جاتا تھا، کمر ٹوٹنے لگتی تھی، ہاتھ پیر سن ہو جاتے تھے، آنکھیں جھپکنے لگتی تھیں انہیں اس کے تحصیل علم سے کوئی تعرض نہ تھا بشرطیکہ وہ ان کے ننگے جسم اور بھوکے پیٹ کا بھی خیال رکھے۔ اور وہ ان کا خیال رکھتے رکھتے اس حالت تک پہنچ چکا تھا کہ صحت جواب دے چکی تھی۔

ابھی حیران کن کامیابی کا اثر جیسے جیسے اس کے دماغ سے زائل ہوتا گیا ویسے

ویسے وہ اداس ہوتا گیا۔ اب تک تو وہ ٹیوشن دے کر، نوکری کر کے، اسکالرشپ حاصل کر کے سیکھتا چلا آیا تھا۔ کیا وہ آئندہ بھی یہی کرے گا۔ لیکن یہ ناممکن نظر آرہا تھا۔ اس کا یہ خیال خام نظر آتا تھا کہ ایم۔اے میں اگر اسے کلاس مل جائے تو اس کی ساری ریاضت سپھل ہو سکتی تھی۔ بھلے سے کوئی اچھی سی ملازمت ڈھونڈ لیتا۔ زندگی مزے میں بسر ہوتی۔ کیونکہ وہ اس منزل کے لئے ساری نیکیاں خرچ کر چکا تھا، اور منزل ابھی دو سال کی کٹھن دوری پر تھی۔ اسکالرشپ بند ہوئے دو ماہ ہو چکے تھے۔ کوئی ٹرسٹ کب تک اسے سکالرشپ دیتی رہے گی۔ ٹیوشن وہ اب نہیں دے سکتا تھا۔ ٹیوشن دینے کے معنی تو یہ ہوں گے کہ وہ بے موت مر جائے۔ اسے اگر اب آرام و اطمینان نہ ملے تو وہ ایک برس بھی نہ جی سکتا تھا۔ صرف نوکری سے اخراجات پورے ہونے سے رہے۔ پھر وہ کیا کرے، بھاڑ میں جائے۔ اس کے تعلیم حاصل کرنے کا شوق، بڑا آدمی بننے کے منصوبے، اس کا روشن مستقبل ــــ یکلخت وہ اپنے سر کو جھٹک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا جیسے وہ ان سوچ بچاروں سے تنگ آگیا ہو۔ کرکٹ کھیلتے ہوئے لڑکے غائب ہو چکے تھے۔ گلے بازی میں مصروف نوجوان اب سیاست پر چاندماری کر رہے تھے۔ موضوع ہندوستان کی آزادی تھا۔ اور کوئی کہہ رہا تھا: "یہ آزادی ہو ہی نہیں سکتی۔ انگریز چند دنوں کے لئے ہندوستانیوں کو انچارج بنا کر اپنے دیس سردیاں کھانے گیا ہے۔ پھر جیسے ہی اس کی صحت بن جائے گی دیکھتے رہنا۔ وہ دوبارہ آ کے رہے گا۔" دوسرے نے اسے جھڑک دیا۔ "غلط بالکل غلط" جھڑکنے والے نوجوان نے مقررانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ "بھائیو! انگریز تو اب آ نہیں سکتا۔ اس لئے کہ اب اس کے پاس اتنی دولت ہی نہیں ہے کہ وہ ہندوستان کے سفر کے اخراجات برداشت کر سکے۔ اخبارات میں آپ اس کے دیوالیہ پن کا چرچا پڑھتے ہوں گے۔ دراصل یہ اس کی افلاس زدگی ہی تھی کہ ہندوستان کا کروڑوں اسٹرلنگ قرضہ دینے کے عوض

آزادی دے کر اس نے گلو خلاصی کرلی۔" سب بے تحاشہ قہقہے لگانے لگے۔ الطاف بھی مسکراتے ہوئے سوچنے لگا۔ "کیا شک ہے اس میں۔ ڈالری جمہوریت کا زمانہ جو ہوا۔ آزادی لینے یا آزادی دینے کے لئے خون بہانے کی بات تو پرانی ہو چکی۔" مگر اس نے دیکھا۔ شکیل پر اس دلچسپ بحث کا کچھ بھی اثر نہ تھا۔ وہ اب لمبی لمبی سانسیں لینے کی ورزش کر رہا تھا۔ کتنا لاابالیانہ پن تھا اس میں یہ اس کی بے پروائی ہی تھی کہ پڑھائی نہ کر سکا۔ حالانکہ اسے سیکھنے کی بہت سہولتیں تھیں۔ لیکن امتحان میں نہ بیٹھنے کا سبب دوستوں کو یہ بتاتا تھا کہ وہ آئندہ سال علیگڈھ یونیورسٹی سے بی۔اے کریگا۔" انسان ہونے کی حیثیت سے اسے بھی یہ دعویٰ کرنے کا حق تھا کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ پھر بھی اس کی جائے مستقر اور علیگڈھ کے درمیان سینکڑوں میل کے فاصلہ کو دیکھتے ہوئے اس کا یہ دعویٰ مبالغہ سے کچھ کم نہ تھا۔ اس کے پڑھائی نہ کرنے کا سبب علاوہ بے پروائی کے یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ فیلٹ ہیٹ اور اونی سوٹ کے نہ ملنے پر اپنے والدین سے خفا ہو گیا ہو۔ (کیونکہ اس کے والدین چاہتے ہیں کہ وہ پڑھ لکھ کر قابل بن جائے، اپنے مستقبل کو سنوارے) اس کی چند طے شدہ ضروریات تھیں۔ جیسے کہ وہ بی۔اے میں اونی سوٹ اور فیلٹ ہیٹ خریدنا چاہتا تھا۔ ایم۔اے میں سگریٹ پینا شروع کرنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتا تھا۔ زندگی میں ایک بار پورے ہندوستان کا سفر ضروری خیال کرتا تھا۔ جس میں چاندنی رات کا تاج محل، بنارس کی صبح، کشمیر کی برفباری، بمبئی کی دیوالی، میسور کا دسہرہ بھی شامل تھے۔ ماں باپ تھے بے چارے، محبت کے مارے اپنی ضرورتیں ملتوی کرکے اس کی ہر جا بیجا خواہش پوری کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ دوست ایسی خواہش سن کر کیسے چپ رہتے کوئی مذاق کرتا۔ "میں نے شراب نوشی اور رنڈی بازی بڑھاپے کے لئے رکھ چھوڑی ہیں۔" دوسرا تجویز پیش کرتا۔ "اور کربلا کا محرم بھی دیکھنے کی چیز ہوگا نا یار۔"

یوں اس کی خیالی فردوس، مضحکہ خیز بن جاتی۔

وہ بہت کم دوسروں کی باتوں میں حصہ لیتا۔ ہر گھڑی اپنی خیالی فردوس میں مگن رہتا۔ اس کا مشاہدہ اتنا تیز اور صحیح ہوتا کہ وہ کسی چیز کو دیکھ لینے کے بعد اس کی تصویر پوری جزئیات کے ساتھ گویا ذہن میں اتار لیتا تھا۔ اس کے بال جب پیشانی پر لہراجاتے تو اس کا سانولا سلونا چہرہ اور جاذب نظر بن جاتا۔ اس کے چہرے کے گول گول نقوش اور بھی دلکش بن جاتے۔ اس کی چال میں ایک متوازن وقار تھا۔ وہ بہترین ادبا اور شعرا کی تصنیفیں منگا کر رکھ چھوڑتا۔ پنسل سے اسکیچس کھینچتا، انگریزی فلمیں دیکھتا اور سر جھکائے ہوئے گھومتا ہوا دکھائی دیتا۔ نیز اپنے پیارے جذبات کو ٹھیس پہنچانا، اس کے خیال میں سب سے بڑا گناہ تھا۔ ماضی پر غور کرنا اس کے نزدیک قبرستان کی چوکیداری کے برابر تھا۔ اور مستقبل پر سر مارنا انسانی عظمت کی ہتک سمجھتا تھا۔

"او ـــ آپ ـــ بیٹھئے بیٹھئے۔" اچانک صدیقی کو دیکھ کر کچھ حیرت سی ہوئی۔ صدیقی مٹھی میں دبے ہوئے سگریٹ کو جھٹک کر ہلکے ہلکے کھانسنے لگا۔ "کیا ہے الطاف صاحب ـــ ایں۔" وہ زمین پر رومال بچھا کر بیٹھ گیا۔ اور انہیں کھسیانا دیکھنے لگا۔

"آپ یہاں۔"

"کچھ نہیں۔ ڈاکٹر کا مشورہ ہے۔ میں روز تفریح کو جایا کروں۔" اس لئے کہ کچھ دنوں سے اسے سوکھی کھانسی کی شکایت ہے۔ الطاف کو حیرت اس لئے ہوئی تھی کہ صدیقی ایک نیم مذہبی نیم سیاسی قسم کا معروف آدمی تھا۔ یہاں کیسے ٹپک پڑا؟ ادھر کچھ دنوں سے اس کا چرچا کم ہے تو کیا ہوا۔ چند سال پہلے تک تو اس کے قومی جذبہ اور جوشِ ملت کا دور دور تک شہرہ تھا۔ اس کی بے لوثی، خلوص اور دردمندی کی تعریفیں تھیں۔ اسی کی

کوشش سے جگہ جگہ نوجوانوں کی ٹولیاں منظم ہو گئی تھیں، قوالی کی محفلیں، سیاسی پارٹیاں، قومی و مذہبی انجمنیں، پہلوانی اور لاٹھی کے اکھاڑے اور ان ٹولیوں کو ایک مرکز پر اسی نے متحد کیا تھا۔ مرکز کے جب جلسے ہوتے تو وہ انگریز کے توسل سے ملی ہوئی خفیہ خبریں یا بے بنیاد ناسمجھ مسلمانوں میں پھیلاتا تھا۔ "متحد ہو جاؤ، بہادر بنو محرم پر فساد ہونے والا ہے۔ ایک پرائیویٹ صحبت میں کلکٹر بہادر نے مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے۔" پھر ایک دھوم سی مچ جاتی قوالی کی محفلوں سے چندہ جمع کیا جاتا۔ دینی تعلیم کے مدرسے کھولے جاتے، لاٹھی اور پہلوانی کے مظاہروں سے غیر مسلم عوام کے دلوں پر بہادری کی دھاک بٹھائی جاتی۔ تب یہ کوئی بھی نہ جان سکا تھا کہ یہ محض الیکشن اسٹنٹ ہے۔ مسلم فرنٹ کی جانب سے ان کا ایک دوست ایم ایل اے کا امیدوار ہے۔ اور جب وہ الیکشن میں کامیاب ہو گیا۔ تو مرکز کے جلسے بند ہو گئے۔ اخبارات و رسائل کی دی۔ پیاں واپس ہونے لگیں۔ مدرسوں کو تنخواہ نہ ملنے پر دینی تعلیم کے مدرسے بند ہو گئے۔ حتیٰ کہ مرکز کو صدیقی صاحب کا نیاز حاصل ہونا بھی مشکل ہو گیا۔ اور جب ملک تقسیم ہو گیا اور فسادات کی آگ بھڑکی تو وہ عظیم الشان بورڈ چپکے سے اتار لیا گیا جو مرکز کے ماتھے پر بڑے بڑے حروف میں کلنک معلوم ہو رہا تھا اور جب جگہ جگہ مسلمانوں کے گھروں کی تلاشیاں اور گرفتاریاں عمل میں آنے لگیں تو متعلقہ کاغذات جلا دئے گئے۔ اور مرکز کے دروازے پر قفل ڈال دیا گیا۔

اور اب وہ الطاف سے اس کی موجودہ سرگرمیوں سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد اس سے کہہ رہا تھا۔ "جب تک ہم اپنے آپ کو ایک سچا دیندار نہ بنائیں گے ہماری بات کا اثر پیدا نہ ہوگا، ہماری مصیبتیں ختم نہ ہوں گی۔ دیکھئے ہم ایک پروگرام بنائے ہیں سر دست تین وقت کی نمازوں کی فرصت ملتی ہے۔ اور رات عشاء کے بعد باترجمہ قرآن مجید اور حدیث و فقہ کی کتابیں پڑھی جاتی ہیں۔ اب ہمیں معلوم ہو رہا ہے اسلام کیا چیز ہے۔

کیا کیا جواہرات ان خزانوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ یوں سمجھو زندگی کے تاریک سے تاریک گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ تم بھی اپنے اپنے محلوں میں ایسے پروگرام پر عمل کرو اور یہ سیاست و بلمعت کو جھونکو چولہے میں۔ یہ سب بیکار ہے۔" وہ اب ہر وقت خوفِ قیامت سے دبے ہوئے سینوں سے لگا رہتا۔ غیر مذاہب پر نہایت مکروہ حملے کرتا موجودہ زمانے کی شرک و بدعات کی مذمت کرتا تھا۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد سے وہ سیاست پر مذہب کو ترجیح دے رہا تھا۔ اور مسلمانوں کی بھلائی سیاست کو خیرباد کہنے، کٹر ملائیت کو اوڑھنا بچھونا بنا لینے میں دیکھتا تھا۔ دراصل یہ بھی ایک سیاست تھی۔ نہایت ہی گندی۔ جو مذہب کے شریف اقدار کے نام پر بھولے انسانوں کو زمانے کے انقلابات سے غافل رکھنے کے لئے کھیلی جاتی ہے۔

"شریعت کہتی ہے ــــــ"

"بس قبلہ بس" الطاف نے طنز بھرے لہجے میں جھاڑ دیا۔ "سینکڑوں برسوں سے آپ کہہ رہے ہیں اور میں کر رہا ہوں۔ نمازیں پڑھتا ہوں، روزے رکھتا ہوں، حج کرتا ہوں، زکوٰۃ دیتا ہوں، خدا جس حال میں رکھتا ہے اسی میں خوش ہوں، دنیاوی مصائب کا شاکی نہیں اور مالک کا شکر ادا کرتا ہوں۔ اب ــــ اور کیا سنانا چاہتے ہیں۔ مگر ــــ کبھی آپ سے کہا نہیں گیا کہ مزدوروں کا ہڑتال کرنا جائز ہے۔ کیونکہ وہ ایک انسان کی بیجا لالچ کا شکار ہوتے ہیں اور اپنی حلال کی کمائی کا حق مانگتے ہیں۔ کسان کا زمیندار کے خلاف اندولن روا ہے۔ کیونکہ زمین کا مالک خدا ہے۔ اور جو اسے بوتا ہے وہی اس کے پھل کا حقدار ہے۔ خدا کی مخلوق کو بھوک، بیماری اور جہالت کے اندھیروں سے نکالنے کے لئے انقلاب لانا مشیت ایزدی ہے۔ اور سامراج کو جہنم واصل کرنا عین ثواب ہے۔ کیونکہ وہ ذاتی نفع کی

خاطر بنی نوع انسان کو جنگ کا ایندھن بناتا ہے ۔اور ـــــــ"

"اوہ ـــــ آپ تو جوش میں آگئے۔"

"جی ـــــ آپ خاموش ہی رہیے۔"

اور وہ دونوں خاموش ہوگئے، کہر کے خشک دھوئیں میں پھیکی چاندنی کسی سڑک کے کنارے پڑے ہوئے فاقہ زدہ بھکاری کے دستِ سوال کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ شکیل ان دونوں کی بحث سے اکتا کر گھڑی گھڑی کروٹ بدل رہا تھا جیسے ہی ان پر سکوت طاری ہوگیا اس نے گویا اپنے آپ سے کہا۔

"اٹھو ـــــ چلیں۔"

اور وہ سب کے سب اٹھ کر چل دیے۔

بس ایک چائے کی پیالی

اجی دو ٹکے کا بیلف مجھ سے کہتا ہے کہ نوٹس کی پشت پر لکھو۔ اصل عرضی کی نقل اور نوٹس مل گئے۔ ذرا لہجے کی قصابیت تو دیکھنا۔ ارے وہی تو لکھیں گے جو وہ کہے گا۔ ہم کوئی مرثیہ تو نہیں لکھیں گے اس کا یہاں، دیکھو! — یہ دیکھو نقل۔ مگر یہ نقل تم سے پڑھی نہ جا سکے گی دوست — یہ عدالت والے شرط بد کر بدخط لکھتے ہیں اور خواہ مخواہ تمہاری ٹیکنی کلر آنکھیں میلی ہو جائیں گی۔ مطلب میں اس کا بتلائے دیتا ہوں سنو لکھا گیا ہے "مدعی کروڑی مل ادھار چند اپنے ذاتی مکان واقع جنگلی میٹھ حویلی۔ مدعا علیہ زمان شریف جہان شریف کو سنہ ۱۹۵۲ء میں کرایہ پر اٹھا دیا تھا۔ مدعا علیہ نے مکان میں منتقل ہونے کے بعد سے آج تک یعنی دس سال میں ایک پائی بھی کرایہ ادا نہیں

کیا۔ میونسپل ٹیکس جو مدعا علیہ ادا کرتا آرہا ہے وضع کرنے کے بعد اندازاً چھ سو تیس روپیہ واجب الادا ہے۔"۔۔۔ دیکھا کوئی اس طرح خود سے پوچھے۔ شریفوں کی سادہ لوحی سے یوں فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہماری سادہ لوحی یہ تھی کہ ہم نے شروع کے چند سال کرایہ کی رسیدیں نہ لیتے تھے۔ ابا جان مرحوم سے اس کے تعلقات ہی کچھ ایسے تھے کہ رسیدوں کی ضرورت ہی محسوس نہ کی جاتی تھی۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد جب ہمیں شبہ ہوا تو ہم نے چاہا کہ کرایہ کی ادائیگی کے بعد رسیدیں لے لیں۔ بس یہی چیز کھٹکنے لگی اُسے۔ اور مکان خالی کرانے پر تل گیا۔ مگر ہم نے بغیر رسید کے کرایہ ادا کیا، نہ گھر چھوڑا اور بذریعہ منی آرڈر کرایہ کی رقم روانہ کرتے رہے۔ مگر وہ وصول کیوں کرتا۔ اس کا تو مکان چھڑانا مقصود ہے ۔۔۔ ہوں۔ مذاق نہیں دس برس سے رہتے آرہے ہیں اس مکان میں آ دیکھیں کون آتا ہے مکان چھڑانے۔ تم اتنا کرو دوست کہ کوئی ایسا وکیل ڈھونڈ نکالو جو پیشیوں کی تاریخ ٹلانے میں مہارت رکھتا ہو۔ سالا پیشیوں پر کولہا پور سے آکر تنگ نہ آجائے تو نام نہیں۔ فی الحال تو وکیل کے چکر میں پڑنے کی ضرورت بھی نہیں۔ پہلی پیشی ہے، حاضر ہو کر عرضی ٹھونک دیں گے کہ وکیل کی پیروی حاصل کرنی ہے پیشی کی مدت آگے بڑھائیں۔ ایک دو مہینے اور آگے چلے جائیں گے۔ ٹھیک ہے نا؟ ۔۔۔ پھر ۔۔۔ پھر۔ جب دوسری پیشی آئے گی تو وکیل کے ذریعے ایک مدت اور لے لیں گے کہ ضروری کاغذات جمع کرنے اور دیکھنے ہیں ۔۔۔ اور اس طرح تیسری پیشی پر یہ ہو سکتا ہے کہ سِک سرٹیفکیٹ حاضر کر دیں۔ بس وکیل کام کا آدمی ہو۔ مواقع پیدا کرنا بڑی بات نہیں۔ سمجھ گئے نا ۔۔۔ لیکن دیکھو ایک کام کی بات رہی جاتی ہے۔ یار! وہ منصف کا کلرک اپنا آدمی بن جائے تو کیا کہنے۔ بس سمجھ لیں گے بیڑا پار ۔۔۔ پروا نہیں پچیس پچاس خرچ ہو جائیں۔ کہیں نہ کہیں سے

انتظام ہو ہی جائیگا۔ ارے بھائی میں نے ہزار بار کہا کہ کرایہ اگر کم ہے تو زیادہ کرلو۔ جہاں ہرماہ آٹھ روپیہ دیتے ہیں وہاں دو چار اور سہی۔ مگر وہ ہماری شرط ماننے پر تیار ہی نہیں کہ ہم اس صورت میں کسی اور کو ہمارا کرایہ دار بنالیں گے ـــــ اب وہ لاکھ کہے۔ دس ہزار کا مکان ہے درست یوں اب وہ آپ روپیہ دے کر مکان چھڑانا چاہے تب بھی نہیں مانیں گے ـــــ لیکن ـــــ ٹھہرو ـــــ اتنی تیزی بھی تو ٹھیک نہیں معلوم ہوتی ہے نا؟ اس طرح دو چار ہزار مل بھی جائیں تو کیا حرج ہے۔ گھر آئی لکشمی کو کون ٹھکرائے گا۔ لیکن ان کوڑھ مغزوں کو کوئی بتائے کہ دو چار ہزار چھوڑئیں تو ہزار بارہ سو میں بھی سودا کرنے کو تیار ہوں۔ بلکہ اگر وقت آپڑا تو اس سے بھی کم۔ اس طرح بزرگوں کی روحیں بھی خوش ہو جائینگی کہ پرانے تعلقات کا لحاظ رکھا گیا۔ نیز خواہ مخواہ جھگڑے کو طول دینے میں کیا رکھا ہے۔ سوائے پیسوں کی بربادی۔ بھاگ دوڑ۔ وکیل سے لیکر کورٹ کے چپراسی تک کو ہاتھ جوڑنا ـــــ ایں۔ لیکن وہاں تو اس کی صورت ہی نہیں نظر آتی۔ الٹا وہ دھمکیوں سے کام نکالنا چاہتا ہے۔ ایک اس مارواڑی کا داماد تھا۔ سپرنٹنڈنٹ پولس۔ وہ مجھے کانسٹیبل کے ذریعے بلاکر کہتا تھا۔ "کیوں رے ـــــ گھر چھوڑے گا یا نہیں۔" شاید ابّا جان مرحوم کو جانتا تھا۔ کہنے لگا۔ "باپ انگریزوں کی بوٹ پالش کرکے زیادہ روپیہ چھوڑ گیا ہے کیا۔ جو کورٹ سے مکان خالی کرانے کو کہتا ہے۔" بھائی میری لاچاری دیکھو۔ میں چپ چاپ ہاں کرکے چلا آیا وہاں سے۔ مگر دوسرے ہی روز کیا دیکھتا ہوں۔ وہ سالا مالکِ مکان یوں اکڑ کر مکان میں گھس آیا کہ آگ ہی تو لگ گئی۔ چھوٹتے ہی تاریخ دریافت کررہا تھا کہ میں مکان کب چھوڑ رہا ہوں۔ وہ ترڑی دی میں نے کہ یاد کرتا ہوگا۔ میں نے کہا۔ کون کہتا ہے کہ میں مکان چھوڑ رہا ہوں۔ اس نے کہا۔ کل ہی تو تم پولس سپرنٹنڈنٹ کے ہاں کہہ آئے ہو۔ میں نے

دانت پیس کر کہا۔ تمہارے پولس سپرنٹنڈنٹ کی ایسی کی تیسی۔ خوب جی بھر کر بدلہ چکایا میں نے۔ سالا میرے باپ کو کہتا تھا۔ انگریزوں کی بوٹ پالش کرنے والا۔ میرا باپ! ــــ کنٹری کا مشہور ادیب، بے باک صحافت نگار ــــ تین رسالوں کا ایڈیٹر۔ کیا ہوا۔ کبھی کبھی اس نے انگریزوں کی حمایت کی ہو۔ ان ایسے بد باطن انسانوں نے ہی تو سر سید احمد خاں علیہ الرحمۃ اور ڈاکٹر سر محمد اقبال علیہ الرحمۃ ایسی قابلِ احترام ہستیوں پر بھی الزام دھرتے نہیں شرمائے۔ باقاعدہ ہجویات لکھی گئی ہیں، کوئی لکھ مارا تھا۔ انگریز کی دہلیز پہ سر ہو گیا اقبال۔ سر سید احمد خاں کو تو انہوں نے زندگی بھر چین لینے نہ دیا۔ کیا کیا گالیاں نہیں تراشی انہوں نے۔ ابن الوقت، نیچریہ، وہابی، اللہ اللہ میں کہوں ارے خرد ماغو! وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ یہ سیاست کی باریکیاں تم کیا جانو۔ کسی بڑے آدمی نے کہا ہے۔ جیسا راجہ ویسی پرجا۔ اب کیا ہم موجودہ کانگریسی حکومت کی تعریفیں نہیں کرتے ہیں۔ کوئی ہمیں برا بھلا کہنے کی جرأت تو کیا کرے گا۔ الٹا لوگ ہماری دیش بھگتی کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے ــــ ہاں اب جو اس بھینسے کو میں نے دیکھا کہ وہ مارے غصہ کے لال پیلا ہو گیا ہے۔ ڈیڑھ سو پونڈ کا یہ گوشت پوست کا ڈھیر چلاتا ہوا دو قدم آگے بڑھ آیا تو میرے پیروں تلے سے زمین سرک گئی۔ سچ دوست میں ٹھہرا ایک تھپڑ کا آدمی، ڈر سا معلوم ہوا۔ وہ چلا رہا تھا کہ میں تمہیں پولس کے ذریعے گھر کے باہر نکال دوں گا۔ ڈرتے ڈرتے میں بھی چیخ پڑا۔ میں پرائم منسٹر کو ٹیلی گرام دوں گا۔ وہ اور بپھر گیا۔ میں ابھی تمہاری ہانڈیاں باہر پھینک سکتا ہوں۔ اب جو اس کے تیور میں نے دیکھے تو خیریت اسی میں جانی کہ معاملہ کو طول دینا مصلحت کے خلاف ہے۔ کیونکہ وہ ہندوستان کے وزیر اعظم کا نام سن کر بھی نہ دب سکا تھا۔ میں نے گمبھیر آواز میں رعب جمایا ــــ اے مسٹر میں تم سے بات کرنا نہیں چاہتا، تمہیں جو کچھ کرنا ہے

کورٹ کی معرفت کرلو۔ وہ چیختا چلاتا کھڑا رہا، میں زنانے میں چلا گیا اور اس کے دفع ہونے تک بیٹھا ہارمونیم بجاتا رہا ـــــ ایں، تم ہنس رہے ہو۔ تمہیں تو ہنسنا نہیں چاہئے۔ شاید تم میری مصیبت کا اندازہ نہ کر سکے۔ سچ کہتا ہوں دوست! میری جگہ کوئی اور ہوتا تو کب کا بوریا بستر باندھا ہوتا۔ کیا بتاؤں اس حرامزادے نے مجھے کس کس طرح ستایا ہے۔ وہ کوئی اس کا منیجر بھی تھا۔ دو چار مرتبہ کی زور آزمائی کے بعد اس منیجر کے بچے نے یہ چال چلی تھی کہ محلے کے لوگوں کو اکسادیا تھا۔ اور وہ کدھے میرے گھر کا سوشیل بائیکاٹ سا کر چکے تھے۔ کیا کروں طبیعت اس وقت اتنی منجھی ہوئی نہ تھی۔ افسوس۔ صد افسوس، خاموشی کے ساتھ ان کے ستم سہتا رہا۔ محلے کے لوگ کبھی نل کا پانی بند کر دیتے۔ کبھی اپنے بچوں کو میرے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ کھیلنے سے منع کرتے، شادی بیاہ میں مجھے مدعو کرنا دور رہا۔ انہیں کسی جنازے میں بھی میری شرکت گوارہ نہ ہوتی۔ یوں سمجھو اس وقت میں اچھوتوں کی سی زندگی بسر کر رہا تھا۔ بڑی ذہنی کوفت اٹھانی پڑتی تھی۔ بات بات پر جھگڑا، بات بات پر دھمکی۔ لیکن سچ جانو یہ تمہارا جانی ان کے بڑے سے بڑے ظلم کو بھی سہہ گیا۔ وہ ناہنجار منیجر اس طرح سادہ لوح انسانوں کو دکھ دے کر نہیں معلوم خدا کو قبر میں کیا جواب دے رہا ہوگا۔ ظالم جب زندہ تھا تو دو چار پڑوسیوں کو بھی اکسادیا تھا۔ انصاف کرو بھیا میرے! وہ لوگ رات میں میرے گھر پر بڑے بڑے پتھر پھینکا کرتے تھے۔ ارے کیا بتاؤں اس وقت کا نقشہ، پتھر جیسے ہی پڑنے شروع ہوتے۔ سب کی آنکھیں کھل جاتیں۔ پتھروں کی دھڑام دھڑام سے بچے کونوں میں دبک جاتے، سہمی ہوئی بہنیں ماں، دادی بچوں پر سائبان بنے ٹکر ٹکر ایک دوسرے کو تکا کرتیں۔ مگر وہ جو کسی نیک بندے نے کہا ہے کہ مظلوم کا اللہ والی۔ پھینکے جانے والے پتھر ہی تو تھے۔ بھلا پتھر کیا جانیں۔

میری ہی چھت پر آئیں۔ ایک پتھر میری چھت پر گرتا تو دو چار پڑوسیوں کی چھتوں سے بھی ٹکراتے۔ پستول یا بندوق کی گولیاں تو تھیں نہیں کہ نشانہ خطا نہ ہوتا ہو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پڑوسیوں کی گالیاں اور کوسنے ہی پتھر بازوں کے لئے عبرت کا باعث بن گئے۔ میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس نے یوں غیب سے میری مدد فرمائی۔ البتہ بائیکاٹ کی سختی میں کوئی کمی نہ آئی۔ پھر اچانک ایک روز کیا دیکھتا ہوں، شام میں سات آٹھ بجے محلے کے دس پندرہ آدمیوں کو لے کر وہی مینجر میرے گھر پر چڑھ دوڑا۔ میری غیرت نے بھی جوش مارا۔ دروازے کو پورے زور کے ساتھ کھول کر باہر چلا آیا۔ اور ان لوگوں کو کچھ کہنے کا موقع دئے بغیر ایک ایک کی شرافت کو چیلنج کیا کہ میں نے کبھی تم لوگوں کے ساتھ جھگڑا کیا ہے، کیا کبھی تمہاری بہو بیٹیوں کو بری نظر سے دیکھا ہے، کیا کبھی تمہارے گھروں کو لوٹا ہے، کیا کبھی تمہارے بچوں کو پیٹا ہے۔ کوئی بھی ماں کا لال اپنے بچوں کو چھو کر بتلائے۔ میں نے آج تک کسی کا کچھ بگاڑا ہو۔ لیکن مجھے اس کا بدلہ کیا ملا۔ میرے گھر والوں کو نل کا پانی بھرنے نہیں دیا جاتا۔ انتہا یہ ہے تم لوگوں نے میری چھت پر پتھر پھینکنے کی ذلیل حرکت سے بھی نہیں شرمایا۔ کان کھول کر سن لو۔ میں نے اب تک تمہارے ہر ظلم کو برداشت کیا ہے۔ اور تم نت نئے مظالم ڈھا کر آزما چکے ہو کہ میں کتنا سخت جان ہوں، ہر دکھ کو گھول کر پی جانے کی مجھ میں کتنی طاقت ہے۔ لو ایک مرتبہ اور کہتا ہوں کہ گھر کا معاملہ میرا اور مالکِ مکان کا ذاتی معاملہ ہے۔ تم اس میں مت پڑو۔ اس پر بھی کوئی نہیں مانتا تو آئے ـــــ میں بیچ کھیت للکارتا ہوں۔ انتڑیوں کا ہار بنا کر گلے میں نہ ڈال لوں تو اپنے باپ کی اولاد نہیں چمار کی کہنا۔ بتاؤ خاموش کیوں ہو۔ کبھی میں نے ایسی ویسی بات کہی ہے تم لوگوں سے۔ بولو کہتے کیوں نہیں؟" اوہ ـــ ہو۔ وہ رنگ جمایا میں نے کہ کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ اور پھر میں نے اس طرح

گریز کیا ۔ " لوگو میں جانتا ہوں۔ تم تمام شریف انسان ہو، تم جب اس لئے ہو کہ میری تمام باتیں صحیح ہیں۔ تم بہکائے گئے تھے اور میں یہ بھی اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ ایک اسی مالکِ مکان کے اس ملعون منیجر کی وجہ سے ہمارے تعلقات میں کشیدگی پیدا ہوئی تھی۔ ورنہ ہم تم بھائیوں سے بھی بڑھ کر ہیں۔ جاؤ میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ آج سے پھر ہم تم بھائی بھائی ہیں۔" لوگ خاموشی کے ساتھ اپنے اپنے مکان چلے گئے۔ منیجر نہ جانے کب کا سرک چکا تھا۔ ان لوگوں کے اچانک حملہ آور ہونے کا راز مجھ پر دوسرے روز کھلا کہ گاندھی جی کی شہادت کی خبر لیتے ہی بدباطن منیجر نے لوگوں کو اکسا دیا کہ چلو اسی بہانے میرے گھر کو بھی کربلا کا میدان بنا ڈالیں ۔۔۔ اف ۔۔۔ جب یہ تمام باتیں یاد آتی ہیں تو خون کھولنے لگتا ہے۔ لیکن پھر سوچتا ہوں ۔۔۔ سوچتا ہوں کہ میں ہی کیوں اکیلا اپنی جان کو روگ لگاؤں ۔۔۔ بھئی وہی اپنی اماں جان کے کوسنے ہیں نا ۔۔۔ جیسے ہی انہیں معلوم ہوا کہ مالکِ مکان نے دعویٰ دائر کر دیا ہے۔ بس ان کی زبان بند ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ان کے خیال میں مالکِ مکان بڑا اچھا آدمی ہے اور میں ہی بُرا۔ میرے رویہ اور اس کے منیجر نے اشتعال دلا دیا تھا اسے۔ سو بھئی میں نے تہیہ کر لیا کہ اب اس دنیا سے کوچ کر جاؤں ۔۔۔ پیارے کہا سنا معاف کر دو۔ اس دنیا میں شریفوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ۔۔۔ کیا بتاؤں نوٹس ملتے ہی ایک بڑا اچھا سا پلان دماغ میں آیا تھا کہ مناسب موقع پر اماں جان سے بات کر لوں گا کہ مقدمہ کے لئے وکالت، شہادتیں، رشوتیں وغیرہ اخراجات کے متعلق ان کا کیا خیال ہے۔ اور پھر خود ہی تجویز رکھ دوں گا کہ وطن کا گھر بیچ دیا جائے تو کیسا رہے ۔ مگر وائے ری قسمت یہاں تو پانسا ہی پلٹ گیا۔ اب تو میری صورت دیکھتے ہی بس جیسے ان کی زبان کی چابی کھل جاتی ہے۔ پلٹ کر جواب تو نہیں دے سکتا۔ جانتا ہوں

اگر خدا نخواستہ ایسا ہو گیا۔ تو روٹیوں کے بھی "واندے[1]" ہو جائیں گے۔ بڑی بے حمیت زندگی ہے دوست اپنی۔ سارا قصور اس بدبخت بے روزگاری کا ہے۔ میں اگر آج روزگار پر لگ جاؤں تو دیکھنا یہی اماں جان کیسے رنگ بدلتی ہیں اور روزگار کی کوئی امید نہیں۔ اس لئے میں نے طے کیا ہے کہ بے عزتی کی زندگی سے موت بہتر ہے۔ سو بھائی اب آخری مرتبہ اپنی دوستی کا حق پورا کر لو۔ ارے۔ ارے۔ تم تو چل ہی دیئے۔ بھائی تم تو ہمیں دھتا مت دو۔ دیکھو انکار نہ کرو۔ بس ایک چائے کی پیالی۔ خدا قسم سچ۔ اللہ تمہیں افسانہ نگاروں کا افسانہ نگار بنائے۔

---

[1] روٹیوں کے واندے۔ روٹیوں کے محتاج

سفارش

پتہ نہیں آج احمد کے دل میں سینما دیکھنے اور کسی شاندار ہوٹل میں کھانا کھانے کا چاؤ کیونکر پیدا ہوا۔ اور ان منہ زور خواہشوں کی تسکین کے لئے اپنی جیب کو خالی پاکر وہ ظہیر کے پاس قرض مانگنے آیا تھا۔ ظہیر کو پہلے پہل اس کی الذتیت پر سخت غصہ آیا۔ مگر وہ یہ سوچ کر کہ ایسی اوٹ پٹانگ خواہشیں کبھی کبھی انسان کو بے قابو کر سکتی ہیں خاموش ہو رہا۔ اسے خود ان چھ مہینوں میں کس قدر اذیت ناک تنہائیوں کا احساس ہوا تھا۔ جیسے حسرت و بیچارگی کا ایک غیر مختتم سلسلہ تھا۔ اور جیسے کوئی دامن پکڑ کر ہر وقت کھینچتا رہتا ـــــ " چلو ـــــ اپنے گاؤں بھاگ چلیں۔" یہ دل و دماغ کا تیل کھینچنے والی خشک کتابیں، یہ جھکے ہوئے میز چارپائی کرسیوں کی واہیات خاموشیاں،

ہوسٹل کے کمرے کی اونچی اونچی جیل نما دیواروں کا غیر دلچسپ سپاٹ پن۔ کلاس روم میں پروفیسر کی بے رس آوازیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب کے سب اسے اداس رکھنے کی سازش میں جٹے ہوئے ہیں۔ حد ہے! اس نے دو روز سے سوائے کھانا کھانے اور پانی پینے کے ساری خواہشات کا دم گھونٹ کر رکھ دیا تھا۔ مگر کوئی بھی اللہ کا بندہ سگریٹ کا ایک ٹکڑا، چائے کی ایک پیالی بنا کر نہ دیا۔

اس نے احمد کو اپنے کمرے میں بٹھا کر کلب کی طرف چل دیا۔ کلب میں طلبا کے درمیان تاش، اخبارات، گپیں، کیرم اور ہنسی دل بہلاووں کا ہجوم تھا۔ "دوستو! شاباش اب گڑھ جیتا۔ اس نے خطیبانہ انداز میں اپنا سیدھا ہاتھ اٹھا کر سبھوں کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ چہرے پر گویا مسکینیت کی سفیدی پھر گئی۔ "ایک بوڑھا فقیر آیا ہوا ہے۔ کہتا ہے کل سے بھوکا ہوں۔ مجھے امید ہے آپ لوگ اس کی ضرور مدد کریں گے۔" وہ دامن پھیلائے بڑھنے لگا۔ سوالات بھی ہوتے رہے۔ "کہاں ہے وہ۔ یہاں کیوں نہیں بلا لائے۔" اور تھوڑی دیر میں بیس پچیس روپیہ بھی جمع ہو گئے۔ اپنے کمرے لوٹ کر اس نے دیکھا۔ احمد نہیں تھا۔ پھر وہ کمرہ بند کر کے احمد کو ڈھونڈنے چلا تھا۔ پیچھے سے آواز آئی۔ "ظہیر"۔ احمد پورے ٹھاٹ میں بڑے زناٹے سے چلا آ رہا تھا "بھئی عجیب انسان ہو۔ مجھے اکیلا بٹھا کر اتنی دیر کہاں چلے گئے۔ کہو۔ کچھ بنا۔" اسے تو اپنی بات کی دھن تھی۔ اور اس نے پورا واقعہ سنا دیا۔ احمد لیٹ ہی گیا۔ "واہ یار تم تو استادوں کے استاد نکلے" اور پیسے ملنے کی خوشی میں اسے افلاطون تو کیا افلاطون کا باپ تک بنا ڈالا۔

بازار سے لوٹ کر انہوں نے دیکھا۔ ہوسٹل کے سارے کمرے بند ہو چکے تھے۔ رات کافی بھیگ چلی تھی۔ مگر انہوں نے ساتھ لائی ہوئی مٹھائیوں، کھارے، پان،

سگریٹ وغیرہ کے بنڈلوں کو کمرے میں رکھ کر ہر دروازے پر دستک دینی شروع کی۔ کوئی خراٹے بھرتی ہوئی نیند سے بڑبڑا کر لائٹ روشن کئے بغیر باہر آنے کی جلدی میں دروازے سے ٹکرا جاتا۔ اور ایک آہ سنائی دیتی۔ کوئی "کون ہو۔ کیوں آئے ہو" کے استفسارات شروع کرتا۔ کوئی دیا سلائی کی ڈبیا ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان کی چیخوں اور دروازہ شکن دستکوں سے جھنجھلا اٹھتا۔ کوئی اس شور کو سن کر بڑھتے بڑھتے خاموش ہو جاتا اور لائٹ آف کرکے یہ پہچاننے کی کوشش کرتا کہ یہ غنڈے تو نہیں ہیں۔ اور کسی کے در پر دستک دیتے، چلاتے تھک کر آگے بڑھ جاتے۔ یا بعد میں چٹخنی لگی دیکھ کر کھلکھلا پڑتے۔ پورے ہوسٹل کو یہ کہہ کر پہلے اپنے کمرے چلو سب بتا دیں گے۔ گھیر گھار کر انہوں نے ساری رات جشن منا ڈالا۔

اس رات اس شاندار ضیافت کی موجودگی میں اس کی وجہ معلوم کرنے کی کسی کو زیادہ فکر نہ ہوئی۔ مگر بعد میں احمد سے کسی ماہر نفسیات نے اصل بات اگلوا ہی لی اور وہ کالج میں "بڈھا فقیر" مشہور ہو گیا۔ اور کالج کی زندگی میں ایک دلچسپ کردار بن گیا۔ اس طرح اس کے دل و دماغ پر جو تنہائی اور غریب الوطنی کے احساس کا زنگ لگا تھا چھٹ گیا۔ اور اسے نت نئی شرارتیں کرنے میں مزا سا آنے لگا۔

کلب میں وہ اپنے حواریوں کے ساتھ جب بھی جاتا۔ سب سے ہاتھوں ہاتھ لیتے اور کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ تاش میں اس کی بے ایمانیوں کا مقابلہ کرتا۔ ویسے اس میں اس کا ایک ہی مقصود ہوتا تھا کہ جیسے تیسے کسی کو چائے کے لئے پھانس لیا جائے۔ پھر وہ سبھوں کو لے کر ایسے تھرڈ کلاس ہوٹل میں جا دھمکتا کہ اس ہوٹل کے باورچیوں سے لے کر مالک تک ان کی خاطر و مدارت میں مشین کی طرح مصروف ہو جاتے اور چند منٹوں کے لئے ہوٹل میں رونق چھا جاتی اور جب وہ وہاں سے اٹھتا تو جیب میں دو تین چمچے یا چھوٹے چھوٹے

پلیٹ ضرور کھنکتے رہتے۔

بل چکاتے وقت وہ مالک سے کہتا۔ "دیکھیے صاحب آپ کے ہوٹل میں نہ ریڈیو ہے نہ گراموفون، کم از کم آپ اپنے نوکروں کو ڈانس ہی سکھا دیتے۔ جو چائے وائے دینے کے بعد خالی وقت میں دل بہلاوے کا سامان بھی مہیا کر سکتے۔"

وہ کلاس روم میں بھی پروفیسروں سے دل لگی کرتے نہ جھجکتا تھا۔ لکچر کے دوران میں قسم قسم کی آوازیں نکالنا، خواہ مخواہ کھانستے رہنا، طلبا کو منہ بنا بنا کر ہنسا تے رہنا، نیز یہ اس کا معمول ہو گیا تھا کہ کالج دیر سے آئے پریڈ زور میں چلا ہو، طلبا لکچر سننے میں محو ہوں۔ اور وہ اکڑا تنا سینے سے کتابیں لپٹائے لیفٹ رائٹ کے انداز میں اپنے ملڑی بوٹوں کو ٹھوق ٹھوق پٹکتا ہوا آدھمکتا۔

"مے آئی کم ان سر"۔ ایک روز انگریزی کے پروفیسر کی غضب آلود آواز گونجی۔

"نو۔" اور وہ ویسے ہی دروازے سے ہٹا۔ بوٹ ٹھوق ٹھوق بجنے لگے دوسرے دروازے سے آواز آئی۔

"مے آئی کم ان سر"

"نو" میز، کرسی، ڈیسک، دروازے کھڑکیاں اس کرخت چیخ سے جھنجھنا اٹھے۔ اور بوٹوں کی ٹھوق ٹھوق اس میں ڈوب گئی۔ مکمل امن ہو گیا۔ طلبا اس حادثے کو قریب قریب بھول گئے۔ اور پروفیسر پوری دلجمعی سے لکچر دینے میں مصروف ہو گیا۔ مگر اس کے لہجے میں کچھ ایسی کرختگی آگئی تھی جیسے کاہن عصائے مقدس کو پٹک پٹک کر دیوتاؤں کے قہر و غضب سے گمراہ انسانوں کو متنبہ کر رہا ہو۔ تب ایک مہین اور دلکش آواز، پروفیسر کے برابر والے دروازے کی آڑ میں تھرتھرائی۔

"مے آئی کم ان سر" ۔ پروفیسر اپنی دھن میں کہہ گیا۔

"ایس" اور ٹھوق ٹھوق کی آواز گونجتی گرجتی کمرے میں در آئی ۔ پروفیسر چونکا۔ کوئی نیا حکم سنانے کے لئے مگر طلبا کے قہقہوں کا بند ٹوٹ گیا تھا۔ اور ظہیر ڈیسک پر بیٹھ چکا تھا۔ مگر ایک بات تھی ۔ ظہیر لڑکیوں کے معاملے میں بڑا بودا واقع ہوا تھا۔ اس کی طبیعت اس ذکر سے یکدم گھبرا اٹھتی۔ اور وہ کسی چور دروازے سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتا۔

" بھئی خدا کی پناہ۔ میں تو چکرا گیا ہوں۔ بتاؤ تو ان تمام لڑکیوں کا کیا کروں۔" وہ احمد کے سامنے لفافوں کا انبار لگا دیا۔ بہت دنوں سے وہ احمد سے مشورہ کرنے کی سوچ رہا تھا۔ احمد مسکرایا اور ان نامہ جاتِ شوق سے کھیلنے لگا ۔ یہ لڑکیاں بڑی مدت سے ظہیر کے سنگِ آستاں پر سر پٹک رہی تھیں۔ اور ظہیر کا کہنا تھا کہ اس نے ان میں سے کسی کا بھی جواب نہیں دیا۔

" مگر کیوں۔ میرا کہنا ہے ۔ ان میں سے کسی ایک کو چن لیتے۔ دیکھو یہ گلابی لفافہ والی کتنی بے تاب ہو رہی ہے ۔ محض ایک ملاقات کے لئے اور وہ تمہاری ہم وطن پر تو ترس کھاؤ۔ بیچاری بڑی مصیبت زدہ معلوم ہوتی ہے۔" اس انبار میں آدھے سے زیادہ اسی کی چٹھیاں تھیں۔ گلابی لفافے والی ایک دو دفعہ جھک کر ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ ایک دو اور بھی خم ٹھونک کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ مگر وہ سب ذرا چار سو بیس کوالٹی کی تھیں — "کیوں۔ کیا خیال ہے۔ کچھ ایسی بری بھی نہیں۔ پسند کر لو نا۔"

"بھئی پسند کرنے کا حوصلہ ہوتا تو تمہارے مشورے کی کیا ضرورت تھی۔ میں پوچھتا ہوں ان آسمانی بلاؤں سے چھٹکارا پانے کی کوئی معقول تجویز بتاؤ۔"

"کہہ جو دیا نا۔ ان میں سے کسی ایک کو اپنا لو۔ باقی سب پھر سے اڑ کر

دوسرے بھٹے پر بیٹھ جائیں گی۔" وہ ایک کاروباری کی طرح کہہ کر چل کھڑا ہوا اور ظہیر کرسی کے ہتے پکڑے بیٹھا سوچتا رہا۔۔۔ سوچتا رہا۔ لگاتار سوچتا رہا۔ مگر اس سلسلے میں اس کا دماغ کچھ زیادہ کارآمد نہیں ثابت ہو سکتا تھا۔ اسے احمد کی تجویز معقول نظر آنے لگی۔ ورنہ ان لڑکیوں کی وقت بے وقت چھیڑوں، دلربایانہ مسکراہٹوں، معنی خیز اشاروں سے تو اس کا بنا بنایا کیرکٹر مٹی کے گھروندے کی طرح ڈھے جاتا۔ احمد نہیں جانتا تھا۔ ظہیر نے اپنے کیرکٹر کو بنانے میں صوفیوں کی سی ریاضت کھینچی تھی۔ آخر اس نے فیصلہ کر لیا اور طلعت کے پاس آنے جانے لگا۔ اس طرح وہ طلعت سے میل ملاپ ظاہر کرکے دوسری لڑکیوں کو جتا دینا چاہتا تھا کہ اس نے اپنا "طور" ڈھونڈ لیا ہے۔ اب انہیں بھی کسی "کنوئیں" کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ پھر وہ اس قیامت سے امان پاکر جب بھی طلعت کے تعلقات کو ختم کر سکتا تھا۔ نیز اسے طلعت کی بات پر بھروسہ تھا کہ وہ پردے کے سبب بازار جاکر ضروریات کی چیزیں خود نہیں خرید سکتی تھی۔ اسے صرف اس کی مدد کی ضرورت تھی۔ مگر آہستہ آہستہ طلعت کے بلاوے زور پکڑنے لگے۔ ایک دو ملاقاتوں کے بعد ان صحبتوں کو ایک خاص ڈھنگ سے رنگین بنانے کی اس نے بے تکلفانہ کوشش بھی کی۔ مگر ظہیر کی بے اعتنائیوں میں کوئی فرق نہ آیا۔ اور وہ اس کی شکایتیں کرتی رہی۔ مگر ظہیر ان شکایتوں کو جمعہ کے خطبے کی طرح خاموش بیٹھ کر سنتا۔ اس کی پیشانی پسینے سے بھیگ جاتی۔ اور کنپٹیاں "بھگ بھگ" جلنے لگتیں۔ طلعت خود ہی تھک کر کوئی فرمائش لگاکر اسے واپس کر دیتی۔ وہ طلعت کی فرمائشیں پوری کرنے میں اتنا منہمک ہو گیا کہ آہستہ آہستہ دوستوں سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ بظاہر وہ اپنے کمرے میں پڑھائی کرتا دکھائی دیتا۔ مگر کچھ سوچتا رہتا۔ یہی سوچتا رہتا کہ طلعت کا رویہ بدلتا جا رہا ہے۔ اسے ایسی نادانی نہیں کرنی چاہیئے۔ وہ تکلف اور سنجیدگی کی ڈور

ڈھیل چھوڑ رہی ہے۔ اس کا انجام ــــ انجام کا تصور اس کے ذہن میں آتے ہی اس کے دل کا ذرہ ذرہ لرز اٹھتا۔ اور جھنجلا کر سوچنے لگتا۔ وہ اس گمراہ لڑکی سے اپنے آپ کو کیسے بچائے۔ پھر وہ اپنی پچھلی ملاقاتوں پر تفصیلی نگاہ ڈالتا۔ اس کی طرف سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہیں ہوئی تھی جس سے وہ اپنے اس مقصد میں جرأت سے کام لے سکتی۔ طلعت کے پاس آنے جانے کا فیصلہ لیتے وقت اس کا خیال تھا کہ جب چاہے تب ان تعلقات کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا دوستوں سے دوری نے اسے پھر اس پرانے مرض میں مبتلا کر دیا تھا جس سے گھبرا کر وہ وطن بھاگ جانے کی سوچ رہا تھا۔ اور کبھی اسے احمد پر غصہ آتا کہ اس نے اس کے کریر (career) کا ستیاناس کر دیا۔ طلعت اور اس کے متعلق دونوں کے درمیان احمد کی داستان سرائی نے اس کی بے داغ جوانی کو رسوا کر دیا تھا۔ اور اب وہ اپنی پچھلی حیثیت کو کسی حالت میں بحال نہیں کر سکتا تھا۔

سرما کی چھٹیوں میں جب وہ وطن چلے تو اس نے ریل کا پورا سفر لیٹ کر گذارنے کا ارادہ کر لیا۔ کیونکہ کالج کے اور بہت سے لڑکے لڑکیوں کے ساتھ طلعت بھی اس کی ہمسفر تھی۔ اور ان سبھوں کے لئے ایک ہی ڈبہ ریزرو کرایا گیا تھا۔ دورانِ سفر لڑکوں اور لڑکیوں میں خوب نبھ گئی۔ جس کے نتیجے میں سارا ڈبہ میووں، مٹھائیوں اور پھولوں سے مہک اٹھا۔ وہ موقع کا منتظر تھا۔ ساتھیوں کی اس مصروفیت میں اس کے لیٹنے کی جگہ ہو گئی۔ نہیں معلوم وہ کب نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا کہ ایک بڑے اسٹیشن پر مسافروں کی چیخ و پکار سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ چائے لے کر جب واپس ڈبے میں آیا تو منظر ہی کچھ اور تھا۔ طلعت کی انگلی کھڑکی کا پٹ گر کر کچل گئی تھی۔ اس کی ساتھی لڑکیاں کچلی ہوئی انگلی پر بھیگا ہوا کپڑا باندھ رہی تھیں۔ وہ پھر لڑھک گیا۔ کالج کھلنے

کے بعد طلعت کی ملاقات میں پہلی شکایت یہی تھی۔

"میری انگلی کچل گئی۔ آپ کی زبان سے ہمدردی کا ایک چھوٹا لفظ نہ نکل سکا" اور وہ کھسیانا ہو گیا۔ لیکن اب وہ کالج آتے ہی والدین کی مرضی کے مطابق سلسلۂ تعلیم ختم کر کے وطن لوٹنے کی تیاری کر رہی تھی۔ یہ سن کر ظہیر کو بے حد خوشی ہوئی۔ اتنی خوشی کہ اس کی زبان سے بے ساختہ طلعت کے والدین کے لئے دعائیں نکل جاتیں۔ مگر طلعت کو اپنی تعلیم کے ادھوری رہ جانے کا کوئی غم نہ تھا۔ وہ اس موضوع کو بدل کر بڑی فیاضی سے اس کا شکریہ ادا کرنے لگی۔

"میں آپ کے احسانات کا بدلہ کیونکر چکاؤں۔ آپ نے میری مدد کرنے میں اپنی پڑھائی کا بھی خیال نہ کیا ــــ میں آپ کی زندگی بھر مشکور رہوں گی ــــ مگر ــــ شاید ــــ مجھ میں ایسی کوئی بات ــــ" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ ظہیر کو محسوس ہوا۔ طلعت کو جیسے ایک یہی بات بتانی تھی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ اور منہ پھیر کر اس نے آنکھیں پونچھ لی۔ اور پھر ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ اور وہ گھبرا کر اٹھنے ہی والا تھا کہ اس نے زبیدہ کا غائبانہ تعارف بڑے ہی پیار اور چاؤ سے کرانے لگی۔

ظہیر کو محسوس ہوا گویا یہ سب اب پھر سال بھر کے لئے، ہیر آئیل، بلاؤز کا کپڑا چوڑیوں، ساڑھیوں وغیرہ کی فرمائشوں کے جوتے میں اسے جوتنے کی سفارش ہے۔

ملا عبدالغنی

میسرز پیش رفت پبلیکیشنز، گلبرگہ ۲